شکاری شکار

اور

جنگل سے پیار

از

رضیہ حسین

شکاری شکار

اور

جنگل سے پیار

از

رضیہ تحسین

مترجم

حضور احمد شفق

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

پیش لفظ

ھندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دھائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اھمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اھمیت دی ہے۔ کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ رھی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اھمیت مُسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلو پیڈیا، ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کررہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہوسکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

فطرت کے اجزائے ترکیبی میں خطرات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جنگل بھی چوں کہ فطرت کے مظاہر میں سے ایک ہے اس لیے جنگل میں پائی جانے والی زندگی خطرات سے گھری ہوتی ہے۔ طاقتور جانور کمزور جانوروں کو اپنی خوراک بنا لیتے ہیں۔ کمزور چرند اور پرند بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے اپنا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ پورا نظام غذا کی ضرورت اور اس کی فراہمی پر منحصر ہے۔ اگرچہ آدمی اس طرح آدمی کو اپنی غذا نہیں بناتا، تاہم اس کے دوسرے طریقے ہیں۔ وہ اس کے جسم کو نہیں مارتا لیکن اس کی روح کو مار دیتا ہے۔

جواہر لعل نہرو

ترتیب

عرض مصنف

جنگل اور پہاڑ کا رشتہ قدرت نے عجیب سا بنایا ہے۔ پہاڑ ہمیشہ جنگل کا ساتھی نہیں ہوتا۔ جنگل پہاڑوں پر بھی ہو سکتا ہے لیکن جنگل میں پہاڑ کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ ہمالیہ کی اونچی چوٹیاں ـــ بدری ناتھ، کیدار ناتھ اور ان سے بھی آگے برف سے ڈھکی ہوئی سفید اور سپاٹ نظر آتی ہیں۔ سورج جب آسمان پر چمکتا ہے تو ان پر کرنوں کی لکیروں سے کھنچے عجیب و غریب دل موہ لینے والے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن اندھیری سنسان راتوں میں یہی چوٹیاں صلیب پر چڑھے آدمی کی طرح خاموش نظر آتی ہیں۔ جنگل مگر جنگل ہے۔ جہاں بھی پنپ جائے، پیڑ پودوں کی افراط کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے پرند و چرند بھی اپنے آپ اس میں پرورش پانے لگتے ہیں اور تب ایسا لگتا ہے کہ یہی ہریالی، یہی امن، یہی زندگی صحیح معنوں میں قدرتی زندگی ہے، ترقی کا یہی راستہ صحیح ہے۔

جنگل کے کلچر کی ابتدا ہی آپس میں مل کر رہنے سے ہوتی ہے۔ مذہبی

میل جول سے بھی ہوتی ہے۔ جیو اور جینے دو، بڑھو، پھلو پھولو اور ترقی کرو۔ یہی اس کلچر کا پیغام ہے۔ شیر، چیتوں سے لے کر بندر، بھالو، چڑیاں تک وہاں رہتی ہیں اور کیڑے مکوڑوں سے لے کر سانپ بچھو تک ساتھ رہتے ہیں۔ کہیں ہری گھاس کی قالین ہے تو کہیں رنگ برنگے پھولوں کی قطار۔ کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں کہ تو کیوں یہاں ہے۔ کیوں پرورش پا رہا ہے، پھیل رہا ہے۔

آدمی کی جب سے یہ خواہش ہوئی کہ وہ مہذب کہلائے۔ اس نے ایک ایسے کلچر کو جنم دینا شروع کیا جس کو محسوس کرو تو دل لرز جاتا ہے۔ خون، خرابہ، لڑائی جھگڑا، جنگ، غلام بنانے کی خواہش، شہنشاہ بننے کی للک، قوت برداشت کی کمی، لوٹ کھسوٹ، تشدد، جلن، حسد وغیرہ انسانی تہذیب کو آج متشدد زہریلی اور لگاتار زہریلی کرتی نظر آرہی ہے۔ جنگل میں آج امن، محبت، شانتی کو ختم کرکے آگ کی لپٹوں سے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

میری پیدائش اس ملک کے ایک ایسے علاقے میں ہوئی جسے قدرت نے پہاڑ، جنگل، جھیلوں اور چشموں سے سجا رکھا ہے۔ خوبصورت پربت مالا کو اپنے اوپر اوڑھے رہتا ہے۔ اسی شہر میں میرے خاندان کی بنیاد اور مکان سب کچھ ہے۔ میرے دادا اللہ بخش تحسین میواڑ کے

مہارانا فتح سنگھ جی کے دور میں حیات تھے۔ مہارانا کی ان پر نظر خاص تھی۔ دادا جان ایک تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور شکاری بھی تھے اپنے والد صاحب سے جب ہم معلوم کرتے کہ دادا جان کو جنگلات سے پیار کیوں ہوا؟ اس بات کا جواب یہ ہوتا کہ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر خوب گھوما کرتے تھے۔ مغلوں کے زمانے میں بڑی بڑی توپوں کو بیل گاڑیوں پر لاد کر ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک لیجایا جاتا تھا۔ یہی ان کا خاص کاروبار تھا۔ یہ بیل گاڑیاں جب اپنی دھیمی اور سست رفتاری سے مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کی چھوٹی بڑی بستیوں اور گھنے جنگلوں سے ہفتوں مہینوں تک چلتی رہتی تھیں تب راستے میں آئے ان جنگلوں، ندی، نالوں، جھرنوں اور پہاڑوں سے پیار کیسے نہیں ہوتا۔ ڈاکوؤں کے گروہ کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے ہتھیاروں سے لیس تو رہنا ہی پڑتا تھا۔

کچھ اس طرح سے دادا جان کو جنگل اور جنگل کے خطرات نے متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے شکاری تھے۔ یہ ان کی عادت اپنے دو بیٹوں میں سے ایک ہمارے والد تفضل حسین تحسین کو وراثت میں ملی تھی۔ والد صاحب جب اپنی عمر کی پختگی تک پہنچے تب ملک کے حالات بدل چکے تھے۔ انتظام کے ساتھ رجحانات کا بدلنا

بھی لازمی تھا. مگر جنگل اور شکار کے سلسلے میں انگریز حکمراں دیسی راجاؤں سے بھی زیادہ شوقین تھے. وہ انتظام پسند بھی تھے انھوں نے جنگل اور شکار کرنے کے لیے قانون قاعدوں کو پوری طرح لاگو کیا جس پر سختی سے عمل بھی کیا جاتا تھا. ان دنوں میواڑ میں والد صاحب" باپو" اور علاقے کے لوگوں میں "تحسین سر" کے نام سے یاد کیے جاتے اور انھیں ایک ماہر نشانہ باز شکاری مانا جاتا تھا. انسان کو جنگلوں سے پیار کے ساتھ ساتھ شکار کھیلنے کا شوق قدرت کی دین ہے. یہ عادت انسان کی زمانۂ ماضی سے چلی آرہی ہے. جب نکیلے پتھروں کے ہتھیاروں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا. لیکن بن مانس کی طرح وہ تب بھی غیر مہذب جانور نہیں تھا (حالاں کہ شکار تب اس کی پہلی ضرورت تھی) اور بلا ضرورت جانوروں کی لاشوں کا انبار لگاکر ان کی کھالوں کی تجارت نہیں کرتا تھا.

باپو کا یہ خیال تھا کہ انگریزی سرکار نے معاشی ترقی کے نام پر جنگلوں کے استعمال کی بھر پور چھوٹ دے کر بڑی ناسمجھی کا ثبوت دیا ہے. جس کے خطرناک نتائج سامنے ہیں. جب باپو سے پوچھا جاتا ہے. کہ شکار کے وقت جنگلی جانوروں سے آپ کو ڈر نہیں لگتا تھا. تو وہ تکلیف دہ درد سے کراہ کر کہا کرتے تھے کہ دنیا کا سب سے خطرناک جانور تو یہ دو پیروں کا جانور ہے. شیر چیتے تو اس کے مقابلے میں بہت کم خطرناک

ہیں جو اپنی حفاظت اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ کچھ کرتے ہیں۔ مگر وہ فساد برپا بھی نہیں کرتے، جمع خوری ان کی عادت نہیں۔ ایک دوسرے کی حدود بھی پار کرنا پسند نہیں کرتے اور باہمی مل کر رہنے کا مطلب جانتے ہیں۔

شکار پر تنقید کرنے والا موڈرن اور تعلیم یافتہ آدمی یہ بھولا ہوا رہا ہے کہ جنگلوں کے مخصوص رکھ رکھاؤ کے لیے شکار ایک ضروری عمل ہے جو جنگل میں قدرتی توازن بنائے رکھتا ہے شرط صرف اتنی ہے کہ شکار کے طور طریقوں پر سختی سے عمل کیا جائے۔ اور یہی بات جنگلات کی کٹائی پر بھی نافذ ہوتی ہے۔ جو جنگل کے قاعدوں اور ضابطوں کی خطرناک حد تک خلاف ورزی کی وجہ سے لعنت بن گئی ہے اور یہ جدید ذہن رکھنے والوں کے لیے ایک چیلنج اعلیٰ ہے۔

شکار ایک اعلیٰ درجہ کا کھیل ہے۔ جو انسان کے لیے قدرت کا تحفہ ہے۔ کہانیوں کے اس مجموعہ میں آپ جو شکار کی کہانیاں پڑھیں گے وہ سچی ہیں۔ صرف نام بدل دیے گئے ہیں۔ باقی یہ وہ حادثات ہیں جن کے درمیان سے میں خود گزری ہوں یا 'باپو' کے منہ سے ان کے بارے میں سنا ہے۔ باپو اپنے شکار کے شوق کے ساتھ ساتھ جنگلات اور اہل جنگلات کے ساتھ اتنا ہی گھلے ملے رہے جتنا ایک اچھے شکاری سے امید کی جا سکتی ہے۔ ان کی شکاری زندگی میں ایسے بھی مواقع آئے ہیں۔ جب جب انھوں نے جنگل کے بہت ہی خوبصورت اور سحر انگیز مناظر میں کھو کر شکار کو بھی بھلا دیا۔ جنگل میں گزارے

ہوئے وہ لمحات ان کی زندگی کے انمول تجربات ہیں۔ اس لیے یہ شکار کی کہانیاں تصوراتی یا خیالی نہیں ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ والد صاحب کے تجربات کا نچوڑ ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

یہ کتاب قاری کو جنگل کی زندگی کی باریکیوں سے متعارف کرانے میں کامیاب رہی تو مجھے خوشی ہوگی۔

خوشی اس بات کی ہے کہ آج کل حکومت کی توجہ جنگلات اور وہاں کی زندگی کی طرف گئی ہے کئی غیر سرکاری ادارے بھی اس کام میں لگے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کام زیادہ تر رسمی طور پر ہو رہا ہے۔

اراولی کی پہاڑیاں آج سپاٹ اور سونی کھڑی ہیں۔ جگہ جگہ پر مٹی بہہ کر ٹیلے نکل آئے ہیں۔ ہریالی کی وہ قطاریں جن پر گھٹائیں عاشق ہوتی تھیں اب نہیں رہیں۔ یہ پہاڑیاں جب تک پھر سے جوان نہیں ہو جاتیں۔ تب تک ان کی گود بھی ہریالی سے خالی رہے گی۔ ہریالی جو زندگی ہے۔

ہریالی جو جوش ہے، امنگ ہے، نزاکت اور نرمی کی علامت ہے۔ ہریالی آج کے زمانے کی اولیں ضرورت ہے۔ اس لیے جنگل اور جنگل میں رہنے والوں کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر اپنانا ہوگا۔ جنگل اور جنگلی جانوروں کے شکار کو روکنے کے لیے حکومت کو سختی سے کام لینا ہوگا۔

شکاری کبھی جنگلی جانوروں کو ختم نہیں کرنا چاہتا یہ تو ایسے ہی کہنا ہوگا جیسے ایک دکان دار اپنی دکان میں آگ لگانا چاہتا ہو۔ شکاری تبھی تک ہے جب تک شکار ہے۔ بغیر جنگل کے وہ ایک ویران چٹان ہے۔

اس کتاب کی زیادہ تر کہانیاں دھرم یگ میں شائع ہوچکی ہیں۔ دھرم یگ کے ایڈیٹر ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی کی میں احسان مند ہوں۔ جنھوں نے ان سچی کہانیوں کو قلمبند کرنے کے لیے مجھے اکسایا۔ ابتدا سے لے کر اس کتاب/مجموعے کے شائع ہونے تک جناب رجنی کانت ورما کا

بھی مجھے پورا تعاون حاصل رہا ان کی بھی میں احسان مند ہوں.

والد صاحب کے علاوہ بھائی رضا، ریاض اور رفیق تحسین نے بھی مجھے اس کتاب کو تیار کرنے میں مدد دی ہے۔ یہ تینوں بھی اچھے شکاری رہے ہیں۔ رضا تحسین آج کل جنگل کی زندگی اور اس کی باریکیوں پر خاص طور سے کام کر رہے ہیں.

۲۰ر فروری ۱۹۸۵ء

رضیہ تحسین
۱۴۔ پنچ وٹی
اودے پور

کتاب کے بارے میں

میں رضیہ تحسین کی زیر نظر فطرت نگاری پر اظہار خیال کی دعوت کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں یہ تصنیف محض شکار نامہ نہیں بلکہ ایک فطرت پرست خاندان کی ترجمان بھی ہے ۔ شکاری کے سنسنی خیز واقعات کے ساتھ اس میں متعلقہ موروثی معلومات و تجربات بھی موجود ہیں ۔ تحریری اسلوب اتنا سہل اور رواں ہے کہ قاری پڑھتے پڑھتے قدرتی ماحول میں یوں کھو جاتا ہے گویا وہ خود بھی اس سیر و شکار میں شریک ہے ۔

اس کے مطالعہ کے دوران مجھے اپنا دور جوانی یاد آجاتا ہے ۔ ۱۹۴۸ء میں تحسین صاحب کی طرح میں خود بھی ہتھیاروں کا کاروبار کرتا تھا ۔ تب ریاستوں کے فرماں روا اسلحہ کے قدردان و شوقین ہوا کرتے تھے یا پھر شکاری ۔ اسی طبقے کی بدولت جنگلی حیوانات کی جانکاری ملتی تھی اور اسلحہ کا استعمال ہوا کرتا تھا ۔ نئے نئے ہتھیار نشانے بازی اور آدم خور درندوں سے علاقے کی حفاظت کے لئے بہت ضروری تھے ۔ مجھے بھی ایسے ماہر نشانے بازوں کے ساتھ شکار میں رہنے کا موقعہ

ملا ہے اور میں نے بھی شکار کو محض تفریح نہیں سمجھا بلکہ یہ فطرت اور جنگل میں جینے والے جانوروں کا مشاہدہ بھی تھا۔ میں نے تحسین صاحب کی طرح ۱۹۴۸ء کے بعد ہتھیاروں کی تجارت ترک کر دی تھی لیکن جنگل اور جنگلی جانوروں کے تحفظ کا کام جاری رکھا۔ احمد آباد کا چڑیا گھر میرے تجربات کی جیتی جاگتی شکل ہے۔

رضیہ تحسین کے والد معروف شکاری رہے ہیں۔ اُس زمانے میں اودے پور سے ۵ میل کے فاصلے پر بھی شکار دستیاب تھا۔ لیکن اس دور میں بھی شکار محض تفریح نہ تھا بلکہ میواڑ کے جنگلات میں بسنے والے قبائل کی زندگی کے لیے خطرناک خوں خوار آدم خور درندوں سے ذریعہ نجات بھی تھا۔ دیہی عوام یا ریاست کی جانب سے کی گئی یہ باحوصلہ شکاری کارگذاریاں تحسین صاحب کی زندگی کا سرمایہ ہے جو انھوں نے وراثت میں اپنی نسلوں کے لیے چھوڑا ہے۔ اپنے بچوں کے ساتھ پرخطر شکاری مہمات پر جانا اور سب کے ساتھ فطرت سے براہِ راست روشناس ہونا غیر معمولی واقعات ہیں جو اس کتاب کا خاص حصہ ہیں۔ یہی نہیں فطرت سے لگاؤ رکھنے کے ساتھ ہی تحریر و تصنیف کا رجحان بھی انھوں نے اپنے بچوں میں پیدا کیا اس موضوع پر یہ کتاب اس کا ثبوت۔ علم و تجربہ جب ادب میں نمود پاتا ہے۔ تو اس سے شاہکار جنم لیتے ہیں۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے قاری فطرت کو اپنی باطنی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ جنگل کی رہگذاروں پر تحسین صاحب قاری کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں

اور وہ ان کے محاکاتی تجربوں سے مستفیض ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دل چسپ اسلوب کے سبب کتاب ادھوری نہیں چھوڑی جا سکتی ـــــ گل باگھ کے شکار کے بیان میں فاری جنگلی پگڈنڈی پر چل کر مچان پر بیٹھ جاتا ہے "کل دیوتا ناگ" میں سانپوں اور بچھو مگری اور راٹن گلہری میں موضوعاتی معلومات موجود ہیں۔ اس طرح یہ کتاب شکار کی داستان نہیں بلکہ قدرت سماج اور حسن فطرت سے متعلق تعارف بھی دیتی ہے۔ اس موضوع پر مس رضیہ نے قلم اٹھا کر ایک مفید اور معلومات افزا کام کیا ہے۔ اس سے قبل انھوں نے اس قسم کی تخلیقات اخبار و رسائل میں شائع کرائی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مصنفہ آئندہ ایسے مفید عام تصنیفی کام کریں اور کامیاب ہوں۔ مصنفہ کے ساتھ ساتھ میں ان کے والد اور دادا کے لئے بھی اظہار احترام کرتا ہوں جو کہ اس کتاب کے روحِ رواں ہیں۔ مس تحسین کے بھائی رضا تحسین جو وائلڈ لائف انسٹی ٹیوٹ کے لائف ممبر ہیں اور محب فطرت ہیں میں ان کی خدمات کے لئے بھی اظہار تشکر کرتا ہوں۔ میں یہ بھی تمنا کرتا ہوں کہ اس تصنیف کے مطالعہ سے فاری فطرت سے لگاؤ اور جنگلی زندگی کی بقا میں دلچسپی پیدا کریں اور اس سے متعلقہ ادب کو فروغ دیں۔

۹ فروری ۱۹۸۵ء	روبین ڈیوڈ
گپتا نگر وسنا	آنریری مشیر و معمار
سرکھیج روڈ احمد آباد	احمد آباد چڑیا گھر

جنگل اور بگھیرا

دراصل لفظ جنگل کو ردیارڈ کپلنگ کی تحریروں نے Forest کے معنیٰ میں رائج کیا ہے۔ کپلنگ (پیدائش ۳۰ دسمبر ۱۸۶۵) نے خط اوسط کے گھنے جنگلات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا جو کہ اس وقت تک انجانے خطے تھے یہ جنگلات روئے زمین کے ساتویں حصے پر مشتمل ہیں۔ کپلنگ نے کسی ذاتی مشاہدے کے بغیر ہی اپنے قیاس پر ان جنگلات کو اپنا موضوع بنا لیا جو اس سے قبل کسی اور نے نہیں کیا تھا۔ اس کی ان تحریروں نے قارئین کو ایک نئے احساس و تجربے سے روشناس کیا اور اسی سبب سے اس کی تحریریں مقبول عام بھی ہوئیں نیز انھیں کے ذریعے لفظ 'جنگل' 'فوریسٹ' پر غالب آگیا۔

یہ لفظ انگریزوں کو بھی ایران سے ملا۔ جب انگریز ایران میں بسنے لگے تو انھوں نے ایرانیوں سے شکار کے متعلق معلومات چاہیں۔ انھیں

بتلایا گیا کہ شکار "جنگمیں" میں ملے گا۔ یہیں سے یہ لفظ بگڑ کر جنگل کی صورت میں ہندوستان چلا آیا اور انگریزی زبان میں بھی داخلہ پا گیا۔ کپلنگ کو یہ لفظ زیادہ ہی مفید مطلب نظر آیا اور اسی کا استعمال اپنی تحریروں میں جاری کر دیا۔

اسی طرح جنگل کے دو خاص چو پائے ہرن اور شیر کے نام بھی ایران ہی کی دین ہیں۔ لفظ ٹائگر ایران کے مشہور دریا دجلہ Tigris کے دھارے کی مماثلت سے وجود میں آیا اور Gazel بمعنی ہرن فارسی لفظ غزال سے مستعار ہے

بگھیرا تیندوا جو اس کتاب کا خاص موضوع ہے میواڑ کے جنگل میں اس وقت افراط سے موجود تھا جس زمانے کی روداد پر زیر نظر کتاب مشتمل ہے۔

یہ جانور اپنا شکار تین طریقوں سے حاصل کیا کرتا ہے۔

۱۔ پانی کے کنارے گھات لگا کر۔

۲۔ شکار ہونے والے جانوروں کی مقررہ رہ گذر پہ گھات لگا کر۔

۳۔ چھپ کر تعاقب اور حملہ کر کے۔

یہ تینوں ہی طریق کار مشقت طلب ہیں۔

پانی پر گھات لگا کر۔ اپنے پانی پینے کے مقام پر ہر جانور چوکنا اور ہوشیار ہو کر آتا ہے کیونکہ وہاں اسے خطرے کا احساس حسی طور پر ہی رہتا ہے ظاہر ہے

شکار کا خود ہوشیار رہنا ہی شکاری کے کام کو مشکل تر بنا دیتا ہے وہ اسے بآسانی نہیں دبوچ سکتا نیز اسے گھنٹوں گھات لگا کر مستعد بیٹھا ہی رہنا پڑتا ہے اور اس پر بھی یہ طے نہیں ہوتا کہ کچھ ہاتھ آئے گا بھی یا خالی ہاتھ اور خالی پیٹ ہی لوٹنا ہوگا۔ اس میں محرومی کا پہلو ہی غالب ہوتا ہے اس لئے وہ یہ طریقہ کم ہی کام میں لیتا ہے۔

راستے میں گھات لگانا۔ اکثر وہ ایسا کرتا ہے کہ چھوٹے جانوروں کی گذرگاہ میں درخت کی کسی ذیلی شاخ پر بیٹھ کر مورچہ بنا لیتا ہے۔ جیسے ہی کوئی جانور اُدھر سے گذرا اور اُس نے اس پر حملہ کیا۔

مگر ان دونوں طریقوں کی بہ نسبت بگھیرا تیسرے طریقے کو یعنی تعاقب کے ذریعہ شکار کو ہی ترجیح دیتا ہے حالانکہ اس میں اسے مشقت شاقہ اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن چوں کہ یہ آمنے سامنے کا معاملہ ہوتا ہے اس لئے امید کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس شکار میں اسے لطف بھی آتا ہے۔

مگر پھر بھی وہ اپنے شکار کا تعاقب بہت دور تک نہیں کرتا۔ بلکہ ایک نپی تلی تند محدود دوڑ لگاتا ہے اور اگر شکار ہاتھ سے نکل جائے تو پیچ و تاب کھا کر ڈکارتے ہوئے لوٹ جاتا ہے۔

بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے بگھیرے کا اپنے مقصود شکار تک پہنچنے میں احتیاط اور صبر کا ملا جلا انداز۔ خصوصاً جب شکار تک پہنچنے کی راہ صاف نہ

ہو ۔ سوکھے پتے چرمرا کر راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں کیوں کہ
شکار کو یہ آواز چونکا دیتی ہے ۔ لہٰذا وہ اپنا گدی دار پنجہ اس احتیاط سے اٹھاتا
ہے کہ حیرت ناک طور پر وہ چرمرا بھی نہیں پاتے ۔ مگر اس میں اسے اس قدر
احتیاط کرنا پڑتی ہے کہ اگر اسے اپنا پنجہ اٹھا لینے کے بعد یہ محسوس ہو جائے
کہ یہ شکار نے یہ دیکھ لیا ہے تو وہ پنجہ ہوا میں ہی اٹھا ہوا رہ جاتا ہے اور خود وہ
پتھر کی مانند ساکت ہو جاتا ہے، جب تک وہ جانور اُدھر سے نظر نہ ہٹالے شکار
پر وہ پندرہ بیس گز کے فاصلے سے ہی لپک جاتا ہے اور پکڑ میں آجانے کے
بعد اس کی گردن میں اپنے چاروں کنائن دانت گاڑ دیتا ہے اور اس کی جان
نکل جانے تک گڑائے رکھتا ہے ۔ اس کے یہ دانت جو آگے سے نکیلے اور پیچھے
سے موٹے ہوتے ہیں ڈاٹ کی مانند گڑے ہوتے ہیں اور اس حالت میں
کافی دیر رہو جانے سے اس کا منہ تھوک سے لبریز ہو جاتا ہے جسے اُسے نگلنا پڑتا
ہے اُدھر زیادہ مشقت کے باعث جسم سے کافی پانی ضائع ہو جاتا ہے جس
کے سبب اس کو پیاس لاحق ہو جاتی ہے لہٰذا وہ مردہ جانور کو گھسیٹ کر کسی
جھاڑی میں چھپا دیتا ہے یا درخت کی شاخ پر لٹکا دیتا ہے اس کے بعد اسے
پیاس بجھانا اور ستانا ہوتا ہے ۔ عام خیال یہ ہے کہ شکار کی گردن میں
اپنے کنائن دانت پیوست کر کے وہ اس کا لہو چوستا ہے چوں کہ اس
سے ہی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے اس لئے وہ فوراً گوشت نہیں کھانے لگتا ہے

مگر علم حیوانات کی رو سے یہ بات صحیح نہیں ہے حقیقتاً وہ گلا گھونٹ کر ہی مارتا ہے اسی لئے زیادہ دیر تک اس کی گردن دبوچے رکھتا ہے جب تک کہ وہ بھوکا نہیں ہوتا تازہ گوشت نہیں کھاتا کیوں کہ تازہ گوشت سخت بھی ہوتا ہے۔

گاؤں کے آس پاس پالتو جانوروں اور کتّوں کو اٹھالے جانا نیز جانور کا پیچھا کرکے شکار کرنا دونوں خصلتیں تینددوے میں ہوتی ہیں۔ یہ گاؤں سے دور جنگل کے اس گوشے کو اپنے لئے منتخب کرتا ہے جہاں انسانی آمد ورفت نہ ہو۔ اس قسم کے شکاری تینددوے کا طریقۂ شکار نرالا اور دلچسپ ہوتا ہے۔ وہ شکار کی گردن کو عقب کی جانب سے اپنے منہ سے پکڑتا ہے اور اگلا پاؤں شکار کے کندھے پر نیز دوسرا اس کے گال پر رکھ کر پچھلی ٹانگوں سے جانور کے دھڑ کو ایک جانب اتنا اینٹھ دیتا ہے کہ اس کی گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ تمام حرکات اتنی سرعت کے ساتھ ہوتی ہیں کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

یہ اکثر چھوٹے جانوروں پر گذارہ کرتا ہے۔ بسا اوقات قدآور تیندوا اونٹ اور بیل بھینس جیسے بڑے جانوروں کو بھی مار ڈالتا ہے لیکن شکار میسّر نہ ہو تو چوہے گلہری اور مینڈک پر بھی اکتفا کر لیتا ہے۔ یہ سؤر گھوڑا اور سیہی کو زیادہ شوق سے کھاتا ہے۔ مگر سیہی کا شکار کرنے میں اُسے زیادہ ہی احتیاط اور چالاکی سے کام لینا ہوتا ہے۔ چوں کہ سیہی اپنے حملآور پر اپنے بڑے بڑے نکیلے کانٹے کھڑے کر کے عقب سے اپنا دفاع کرتی ہے اس

حالت میں حملہ آور شیر بھی ہو تو اس کے پنجے ان کانٹوں سے زخمی ہو جاتے ہیں لیکن اس حالت میں بھی وہ پنجے ڈھیلے نہیں کرتا۔ اس کے برعکس تیندوا سیہی کو منہ کی جانب سے ہی پکڑتا ہے مادہ نر سے زیادہ اپنے بچوں کی نگہداشت رکھتی ہے اور ان سے اس قدر شفقت اور محبت رکھتی ہے کہ وقت آنے پر انکی حفاظت کرنے میں اپنی جان پر بھی کھیل جاتی ہے یہ نگرانی اور دیکھ بھال وہ مکمل دو سال تک کرتی رہتی ہے۔ مادہ کی مدت حمل تیرہ ۱۳ ہفتے ہوتی ہے اور وہ دو سے تین تک بچے ایک بار میں دیتی ہے۔

آدمی اور بگھیرے کا رشتہ

شیر کی نسبت تیندوا آدمی سے زیادہ قریب رہتا ہے۔ شیر بستیوں سے کافی دور گھنے جنگل میں رہنے کا عادی ہے اس کے برعکس تیندوا اجاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان بھی بود و باش کر لیتا ہے لہٰذا کھلے مقامات پر آنے جانے میں اسے تامل نہیں ہوتا۔ دیہی بستیوں کے قریب اس کا آنا جانا اور وہاں سے بھیڑ بکری میمنا یا کتے کو اٹھالے جانا عام واقعات میں سے ہے اس لئے آدمی اور تیندوا ذرا نزدیک ہو گئے ہیں۔

گاؤں کے باڑوں گھروں میں داخل ہو جانا یا کھپریل ہٹا کر چھپر سے اندر کود پڑنا کبھی دیوار میں توڑ پھوڑ یا شگاف کر لینا نیز سوئے ہوئے انسان

کی چارپائی تلے بیٹھے کتے کو اٹھا لے جانا بھی اس کی غیر معمولی حرکتوں میں سے ہے کچھ شکاریوں کا تو یہ بھی قول ہے استادہ خیموں تک میں بھی یہ اپنے تجسس سے مجبور ہو کر داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ کبھی بہت دلیر (Bold) اور کبھی بزدل بھی بن جاتا ہے۔ ان ساری حرکات کے باوجود بگھیرا آدم خور کم ہی بنتا ہے۔ لیکن جب مجبوری حالات سے بن جاتا ہے تو شیر سے بھی سوا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ شیر تو جنگل میں ہی آدمی پر حملہ کرتا ہے مگر تیندوا تو آدمی کو دبوچنے کے لئے بستی اور گھروں میں خود ہی آگھستا ہے اور کبھی کبھی تو ایسی مکاری اور چالاکی دکھاتا ہے کہ لوگوں کو اس کی زود فہمی کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایک کیل کی پیوٹ والے کواڑ کو بھی اندر پنجہ ڈال کر اٹھا لیتا ہے جس سے دروازہ کھل جاتا ہے لہٰذا آدم خور ہو جانے پر اس کا خاتمہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر اگر یہ آدمی پر حملہ آور ہو جائے تو آخر تک اسے دبوچتا نہیں بلکہ زخمی کر کے چھوڑ دیتا ہے جسے جھپٹا یا پنجہ مار کر چل دینا کہا جاتا ہے مگر شیر ایسا حملہ کرے تو آدمی سے چمٹ جاتا ہے اور جان لے کر چھوڑتا ہے۔

مخصوص حالات کے علاوہ یہ رواداری سے کام لیتا ہے ضرورت سے زیادہ شکار نہیں کرتا اور شکار کو زیادہ تڑپاتا بھی نہیں ایک جانور کے شکار کے بعد دوسرے پاس بندھے جانور کی جان بخش دیتا ہے۔ ہاں مگر کمین ہیں

مشقِ شکار کے دوران یا بکری مرغی کے باڑوں میں گھس جانے کے بعد
کئی جانیں بھی لیتا ہے یا پھر بگھیرن کی معیت میں شکار پر نکلا ہو تو مزاجگی
کے مظاہرے کے خاطر بھی ایسا کر بیٹھتا ہے۔

جب آدمی پر حملہ کرتا ہے تو شیر کی طرح سامنے سے نہیں بلکہ ... کے
زاویے سے کرتا ہے۔ تیزی اور سرعت سے اس پر لپکتا ہے۔ پاس آکر
لمحہ بھر رک کر اچھلتا ہے جس سے کہ کھڑا ہوا آدمی زمین پر گر جائے۔

کوئی شکاری جانور آدمی پر حملہ کرتے ہوئے اس مسئلے کا شکار ہوتا ہے
کہ آدمی کے زمین پر عمودی کھڑا ہونے کے باعث اس کے نازک ترین جسمانی
حصّے اس کی سیدھی زد میں نہیں ہوتے اس لئے وہ کھڑے ہوئے
آدمی کو پہلے نیچے گرا لینے کا مرحلہ پورا کرتا ہے اس کے بعد ہی اسے دبوچتا
ہے۔ جنگلی بھینسا بھی آدمی کو پیروں تلے کچلنے میں یقین رکھتا ہے۔ سبھی جانور
یہی کیا کرتے ہیں۔ ایک عجیب بات جو کہ پالتو جانوروں میں بھی دیکھی جاتی ہے
وہ یہ ہے کہ آدمی کی طرح راست کار ـــ Right Hander ہوتے ہیں
چاہے گائے کا سینگ مارنے یا سور کی تھوتھنی، وہ ہمیشہ داہنی جانب ہی گردن گھماتے
ہیں شیر، تیندوا سور اپنے شکار پر داہنی طرف سے ہی وار کرتے ہیں اس حملے
سے بچنے کے لئے موزوں ترین طریقہ یہ ہے کہ جب حملہ آور قریب آجائے
تو آدمی تیزی سے بائیں جانب ہٹ جائے۔ تب لازمی طور پر حملہ آور تلملا نے

لگے گا اور اپنی گردن جھٹکے گا کیونکہ بائیں جانب وہ بہ آسانی مڑ نہیں سکتا۔

یہاں بگھیرے (تیندوے) اور چیتے میں امتیاز کر لینا ہی بہتر ہوگا کیوں کہ عموماً لوگ تیندوے کو ہی چیتا سمجھتے ہیں۔ مگر چیتا الگ جانور ہے جسے انگریزی میں Hunting Leopard کہا جاتا ہے یہ سنہرا کم اور سیاہی مائل زیادہ ہوتا ہے تیندوے سے کچھ چھوٹا اور پتلا ہوتا ہے مگر یہ دنیا کا سب سے تیز رو جانور مانا گیا ہے بدقسمتی سے اس پرکشش جانور کی نسل کو بچایا نہیں جا سکا ہے۔ اس لیے بگھیرے یا تیندوے کو چیتا کہنا غلط ہے۔

رضا تحسین
۱۸-۲-۸۵
لائف ممبر انڈین وائلڈ لائف،
پروٹیکشن انسٹی ٹیوٹ دہرہ دون

تیسری گولی

دیلوا س شکار کیمپ کی یہ داستان جتنی سنسنی خیز ہے اتنی ہی المناک بھی ہے اس المیے کے سبب جو اس شکار کیمپ کے خاتمہ کے فوراً بعد اسی جنگل میں رونما ہوا۔

اودے پور سے تقریباً تیس میل دور جنوب میں پرساد نام کی جاگیر تھی وہاں کے جاگیردار شیو سنگھ ہمارے والد (تفضل حسین تحسین یعنی باپو) کے قریبی دوستوں میں تھے۔ یہ دوستی بھی سیر و شکار کے سلسلے ہی سے تھی۔ اس شکار کیمپ کے کچھ روز قبل ہی ٹھاکر موصوف کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ہوا یوں کہ اپنے فرسودہ اصول کے تحت مادہ سور کو گولی نہ مارنے کی خاطر انھوں نے اسے اپنے قریب سے گذر جانے دیا اور خود بچاؤ کے لئے درخت کی شاخ سے لٹک گئے اس درمیان وہ اپنے دانت سے ان کی ٹانگ پر وار کر کے بھاگ نکلی تھی۔

جاگیر کا چھوٹا سا گاؤں دیلوا س پرساد سے تین میل فاصلے پر پہاڑیوں

کے درمیان واقع ہے یہاں ایک بڑا نالہ بھی تھا اور یہیں ٹھاکر کے کھیت کھلیان بھی تھے۔

ایک دن انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ اس نالے پر باندھ بنا کر اسے جھیل میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ آس پاس کا علاقہ آباد ہو سکے۔ والد صاحب سے جب انھوں نے مشورہ کیا تو اس پر ان کی تائید بھی ہو گئی چنانچہ جلد ہی اس منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ کام ٹھاکر نے اپنی ہی نگرانی میں شروع کر دیا کسی انجنیئر کی حاجت انھیں محسوس نہیں ہوئی۔ جنگل میں خیمے نصب ہو گئے یہاں ٹھاکر صاحب مقیم ہو گئے۔ ہمارے باپو بھی اِس دوران وہاں وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہے دو ڈھائی سال کے عرصے میں آخر یہ کام اختتام کو پہنچ گیا۔ ایک مضبوط پختہ بندھ بن جانے کے بعد وہاں ایک چھوٹی جھیل وجود میں آگئی ــــ یہ کام ختم ہو جانے پر وہاں کافی چونا ریت بچ رہا تھا جس کا استعمال باپو کے مشورے سے باندھ کے دوسرے سرے پر ایک ریسٹ ہاؤس کی تعمیر میں کیا گیا۔

یہ تعمیری مرحلہ پورا کر لینے کے بعد ٹھاکر صاحب کو کافی اطمینان اور خوشی تھی جلد ہی انھوں نے یہاں ایک شکار کیمپ کا بھی منصوبہ بنا لیا۔ چنانچہ باپو سے اصرار کیا گیا کہ وہ کچھ دنوں بمعہ خاندان وہاں آکر قیام کریں۔ باپو نے جب ہمیں خبر سنائی تو ہم سب بھائی بہنوں کو غیر متوقع طور پر خوشی ہوئی بلکہ یہ کہیئے کہ خوشی سے ناچ اٹھے والدہ نے بھی سفر کی تیاری شروع کر دی کیوں کہ ہم۔ ہ

ہفتے جنگل میں قیام کا ارادہ تھا۔ وہ اس لئے بھی خوش تھیں کہ خود شکار کا شوق رکھتی تھیں۔

یہ اپریل ۱۹۴۵ء تھا ہم اودے پور سے دیل واس کے لئے روانہ ہو گئے طلوع آفتاب سے کافی پہلے دھندلکے میں ہی گھر سے نکل پڑے ۔ پرکیف خنک ماحول میں اراولی کی گھاٹیوں سے گذرتے ہوئے جنگل کی کچی پکی سیدھی ٹیڑھی راہ طے کرتے ہوئے ہم پرساد پہنچ گئے جہاں ٹھاکر صاحب پہلے ہی ہمارے منتظر تھے۔ دن بھر آرام کے بعد شام کو ہم ٹھاکر صاحب کی معیت میں دیل واس روانہ ہو گئے۔

راستے میں کھلیانوں میں گیہوں سوپوں سے برسایا جا رہا تھا۔ آخر بیلوں کے پیروں تلے اناج کے خوشے روند کر اور پھر اس طرح برسا کر ہی ان دنوں اناج نکالنے کا طریقہ رائج تھا۔ شام ہونے کو تھی سورج کی ٹھنڈی پڑتی شعاعیں کھلیان کو سنہری لباس پہناتی ہوئی مغربی افق میں سمٹ رہی تھیں۔ دوسری سمت نیلم سی چمکتی ہوئی ننھی جھیل تھی جس کی پال سڑک سے بلند ہو کر اپنے ساتھ دو سڈول چھوٹی برجیاں اٹھائے ہوئے تھی۔ آگے کھلیان کے بعد باغیچہ تھا جہاں پپیتے اور گنا بہ افراط نظر آ رہا تھا۔ دوسرے کنارے پر نو تعمیر بنگلہ تھا جو ہماری قیام گاہ بننے جا رہا تھا۔ ایک جانب جھیل دوسری جانب باغ اور سامنے چٹیل میدان جس پر دور دور تک کھجور کے درخت استادہ

تھے۔ درمیان میں جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں یہ سب کچھ مل کر سہانا منظر پیش کر رہے تھے۔ میل بھر کے فاصلے پر جھیل کی تلہٹی میں ۵۔۴ گھروں کی مینا بھیل قبائل کی بستی نظر آتی تھی۔ بنگلے کے ارد گرد چوکیدار کی جھونپڑی کے علاوہ اور کوئی مکان نہیں تھا۔

باغ کے کنارے پیپل برگد گولر اور املی کے کئی بڑے بڑے سایہ دار درخت تھے جن پر خصوصاً پیپل پر ہر صبح و شام ہریل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے پھل کھانے آیا کرتے تھے ضرورت کے مطابق ان میں سے کچھ شکار ہماری امی بھی کر لیا کرتی تھیں۔ ہریل تیتر بٹیر مچھلی کا شکار تو اس طرح ہوا کرتا تھا گویا بازار سے جا کر سودا خرید لائے ہوں۔ کچھ اس قسم کی ترتیب بن گئی تھی کہ ایک دن اگر مچھلی کا شکار رہا تو آئندہ دن کسی پرندے کا۔ یہ روزمرہ کے چھوٹے شکار تھے جن کے ساتھ کبھی کبھی خرگوش ہرن کا بھی نمبر لگ جاتا تھا۔ لیکن اس کیمپ میں خصوصیت کے ساتھ جس کا ذکر مقصود ہے وہ تیندوے کا شکار تھا جس کی تفصیل آگے درج ہے۔

پہلا ہفتہ تو سیر کے ساتھ اس شکار کے امکانات کے جائزے میں گذر گیا گرد و نواح کے دیہات میں مقامی قبائل کو مطلع کیا گیا کہ کہیں انھیں تیندوے کا پتہ لگے تو وہ فوراً اس کی اطلاع دیں۔ اطلاع لانیوالے کو انعام کی پیش کش بھی تھی ایسی اطلاع آنے پر شکاری مقررہ مقام پر جانے

اور مچان کے شکار کی تجویز بے کر آتے جسے باپو مسترد کر دیا کرتے تھے یہ دیکھ دیکھ کر ہم مایوس ہوتے رہتے تھے مگر کر کچھ نہیں سکتے تھے آخر ایک دن ٹھاکر صاحب کو کہنا ہی پڑا "تمہارے جیسا شکاری ٹھاکر شوسنگھ کے جنگل سے ایک بگھیرا نہیں مار پایا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے" "ٹھاکر میں یہاں بگھیروں کی کھالیں اکٹھی کرنے نہیں آیا مجھے تو شکار کا کھیل اڈ وینچر کھیلنا ہے۔ اس بار صرف ہانکے کا شکار ہی کھیلوں گا مچان کا نہیں۔ اس لئے میں ہانکے کے لئے مناسب مقام کی اطلاع کا منتظر ہوں" کسی پھٹکر چھٹ بھیئے شکاری نے تب ٹھاکر کے کان میں بُد بُدایا "بڑے شکاریوں کے نخرے ہیں حضور ہمارا کیا قصور"

آخر ہوا یوں کہ اگلی صبح ہی بیٹر کے جنگل سے بگھیرے کی اطلاع لے کر دیہاتی آپہنچے جہاں بگھیرے نے ایک گھوڑا ہلاک کر دیا تھا۔ اس جنگل سے باپو بخوبی واقف تھے۔ بیٹر کا نام سنتے ہی انھوں نے ٹھاکر صاحب کو ہانکے کا اشارہ کر دیا۔ ٹھاکر خوش ہوئے۔ اطلاع لانے والے کو دوگنے انعام سے نوازا اور ہانکے کے انتظامات کی اپنے شکاریوں کو ہدایات دیدیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد شکار ٹیم روانہ ہو گئی۔ بیٹر یہاں سے ۵ میل دور تھا ہم لوگوں کو ساتھ نہیں لے جایا گیا تھا کیونکہ چھوٹے تھے۔ لہذا ہم ٹیم کی واپسی کے انتظار میں مصروف رہے۔

ساگون اور رونجا کے قدآور درختوں اور گھنی جھاڑیوں سے پٹا

بیٹر کا یہ جنگل ننھی ننھی پہاڑیوں دروں اور چھوٹے میدانی قطعوں پر مشتمل تھا
تقریباً ۸ افراد بگھیرے کے ہانکے پر مورچہ بندی کئے ہوئے مستعد اور تیار تھے۔
"دو ٹونکئے" (نگراں) ایک درخت پر اور دوسرا ایک چٹانی مقام پر اس طرح
متعین تھے کہ بگھیرے کی نقل و حرکت کا پیش گی جائزہ لے کر ضرورتاً اشارہ کرسکیں
اور محفوظ رہیں۔

ادھورے کھائے ہوئے گھوڑے کا بقیہ .... جس مقام پر تھا
اسی کے پاس بگھیرا ابھی محو استراحت تھا جس کی تصدیق گھوڑے کے لوٹتے ہوئے
نقوشِ پا سے ہوتی تھی۔ چنانچہ درّے کے نزدیک نیچے سے گھیراؤ شروع
کیا گیا تھا درّے سے جنگل کی جانب جانے والے راستے پر قریب تین
فرلانگ کا فاصلہ لے کر شکاریوں کا تعینات ہونا طے ہوا ساگون کے ایک بلند
درخت کے سائے میں جھاڑیوں کی اوٹ لے کر باپو کے ہمراہ دو اور اشخاص
تھے جن میں ٹھاکر صاحب کے ایک چچا بھی تھے جو تجربہ کار شکاری
مانے جاتے تھے۔ دوسرا آدمی ڈرائیور تھا جو کہ باپو کی دوسری بندوق تھامے
ہوئے تھا باپو کے قبضے میں اس وقت ان کی رائفل جان رگبی ۲۷۵ تھی۔
پرساد ٹھاکر بذات خود پاؤں کی تکلیف کے سبب شریک شکار نہ
تھے۔ مگر وہ جنگل میں جہاں تک کار کا گذر تھا گئے اور وہیں سے ہانکے کے
انتظامات کا معائنہ کرتے رہے تھے سارا انتظام آناً فاناً میں ہو گیا تھا۔

کچھ ہی وقفے کے بعد ہانک والوں کا شور ابھرا جو کبھی تیز کبھی آہستہ ہوتا ہوا جنگل میں پھیل گیا تھا۔ اصل مقام کے پاس اب بھی خاموشی تھی۔ کچھ دیر تک ہانک والے شور مچاتے رہے اور ایک دوسرے کو پکارتے رہے۔ آخر اس شور وغل سے گھبرا کر بگھیرا دبکتا ہوا آہستہ آہستہ اپنی آرام گاہ سے برآمد ہوا اور شانِ بے نیازی سے کمالِ طمطراق کے ساتھ متوقع راستے سے جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا کسی اور محفوظ مقام کی جستجو میں آگے بڑھنے لگا۔ تبھی ٹونکیوں نے خبردار کیا۔ " دھادھا، اد ہیر وموں کانی آئی ریو ہے"۔ یعنی پہاڑی پر سے ہوتا ہوا بگھیرا مقررہ مقام کی جانب بڑھ رہا ہے"۔ بگھیرے نے اپنے اس بے پرواہ انداز میں بھی اس کی پوری احتیاط رکھی کہ اس کے پنجوں تلے سوکھے پتے چرمرانہ پائیں اور کوئی سنگ راہ لڑھک کر شور برپا نہ کر دے۔ لہٰذا شکاریوں کی نظر میں وہ تب ہی آیا جب وہ ڈیڑھ سو گز دور پہاڑی سے اُن کے مقابل آچکا تھا۔

نظر پڑتے ہی باپو کی بندوق نشانے پر آنے لگی تھی۔ بگھیرا دھیرے دھیرے نزدیک تر ہوتا رہا۔ مقام خاص پر کھڑے ہمراہی خوش تھے کہ بڑے انتظار شاقہ کے بعد یہ منظر پیش آیا ہے کہ جنگل کا راجہ اُن کے نشانے پر ہے۔ سب کی آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں سے ملیں سانسیں رک گئیں کہ بگھیرے کو ان کی موجودگی کا کہیں احساس نہ ہو جائے۔

بگھیرا ۶۰ - ۷۰ گز کی دوری پر رہا ہوگا کہ رائفل کی گڑگڑاہٹ جنگل

میں گونج اٹھی ہانک والوں کی آوزیں خاموش ہو چکی تھیں اسی لمحے بگھیرا زمین پر ڈھک
گیا اس کا گرنا تھا کر ٹھاکر نے اشارہ کیا۔ یعنی ایک گولی اور داغیں۔ مگر باپو مسکرا کر
بولے۔ "کیوں کھاٹرو بگڑواؤ کا کاسا" (کیوں اس کی کھال خراب کرواتے ہو چچا)
اتنے میں زمین پر بگھیرے نے سر اٹھایا فوراً باپو کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا
اور انھوں نے پھر نشانہ سادھ لیا۔ اس دوران وہ دوبار سر اٹھا چکا تھا۔ مگر اٹھ
نہیں پایا تھا کہ دوسرا فائر ہو گیا بد قسمتی سے گولی اس کے سر پر سے نکل گئی۔
دوسری گولی چلتے ہی بگھیرے کی نظر شکاریوں پر پڑ گئی۔ چوں کہ نشانہ چوک
چکا تھا چنانچہ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی اور اس بار وہ کامیاب ہو گیا۔ اس
کا کھڑا ہونا تھا کہ دونوں شکاریوں کے ہوش اڑ گئے۔ بگھیرا تیر کی مانند
ان پر لپکا۔ مگر تیسری گولی نہیں چلی۔ زخمی جانور کا اس طرح لپک جانا تھا کہ سارا
جنگل شمشان کا منظر پیش کرنے لگا شکاریوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ موقع کی
نزاکت سے یہ لوگ ناواقف نہیں تھے اس لئے وہ اپنے وجود کو بھی بھول
بیٹھے اور کسی ان ہونی کے اندیشے سے ان کی سانسیں تھم گئیں۔ وہ بھی اس
طرح کہ انھیں اس وقت خدا بھی یاد نہ آسکا۔ جھاڑیوں کو لانگھتا پیچ و تاب کھاتا
ہوا بگھیرا مجسم بجلی بن گیا تھا۔ باپو کی رائفل کی نال اس بجلی کو گویا اپنی طرف کھینچتی ہوئی
پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ ہانک والے لوگ اس ہیبت ناک منظر کو برداشت
نہیں کر پا رہے تھے دونوں ٹو نکئے جو اپنی جگہ سے سب کچھ دیکھ رہے تھے

ان کی بھی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں ۔ اس پر بھی باپو کی خود اعتمادی حیرت ناک طور پر کم نہیں ہو پائی تھی وہ خوفزدہ بھی نہیں تھے ہاں بہت چاق چوبند ہو گئے تھے ان کے جسم کی حرکت اتنے تک ہی محدود تھی جسم جنبش نہیں کر رہا تھا بلکہ بندوق کی نال خود بخود ہی بگھیرے کی نقل و حرکت سے تال میل بیٹھا رہی تھی۔

پلک جھپکنے کی دیر ہوئی کہ بگھیرا ان کی نشست گاہ سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ جگہ شکاریوں سے بلندی پر تھی۔ وہ پل بھر وہاں رکا۔ اپنی جسامت کے مطابق اس نے اتنے فاصلے کو چھلانگ لگانے کے لئے مناسب جانا تھا یہ منظر دیکھ کر دھڑکنیں رکی جا رہی تھیں آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں نظریں دیکھنے سے قاصر ہو رہی تھیں اور جو سامنے نہیں تھا وہ تصور میں نظر آنے لگا تھا۔

چھلانگ کے لئے بگھیرے کا پنجے دبانا تھا کہ تیسری فیصلہ کن دھائیں ہوئی جنگل کا سکوت پھر برہم ہوا مگر اس سے ساتھیوں کے پتھرائے ہوئے جسموں میں گویا زندگی عود کر آئی ۔ دونوں ٹونکئے اپنی جگہ سے کود پڑے ۔ چوں کہ بگھیرا کچھ بلندی پر تھا تیسری گولی سے وہ لڑھک کر شکاریوں کے قدموں میں آگرا تھا۔ نشانہ قطعی صحیح یعنی پیشانی پر آنکھوں کے درمیان لگا تھا۔

بگھیرے کا گرنا تھا کہ ٹھاکر نے بندوق سمیت باپو کو باہوں میں بھر لیا اور اوپر اٹھا لیا وہ خوشی سے گویا جھوم رہے تھے ۔ باپو کے یہ کہنے پر کہ "ایسی کیا انہونی بات ہوئی کہ آپ اس قدر خوش ہیں" تو ان کا جواب یہ تھا "میں اس لئے

خوش نہیں کہ بگھیرا مارا گیا بلکہ اس لئے کہ تم نے فائر کتنے صحیح وقت پر اور فیصلہ کن طور پر کیا اگر یہی لپکتے ہوئے جانور پر کیا جاتا تو نشانہ چوک جانے میں کوئی شک نہ تھا اور اس صورت میں اس زخمی بگھیرے کے سامنے کھڑے ہم سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ بھی اسی کے ہاتھ میں تھا ۔۔۔۔۔ وہ پھر اگلی گولی داغنے کی بھی مہلت نہ دیتا۔ اس نازک ترین لمحے تم نے جس خوبی اور چابک دستی سے فائر کیا کہ میں تمہاری حاضر دماغی بلند حوصلگی اور نشانے بازی کے فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

یہ سن کر باپو نے اپنے ساتھی رام چندر کی طرف دیکھا جو خطرے کے لمحات میں ایکشن کے لئے بارہ بور تیار کر کے کھڑا تھا ۔ تم کیا کر رہے تھے رام چندر ۔۔ گولی کیوں نہیں چلائی تم نے ؟ رام چندر نے اس کا خوب جواب دیا تھا ”میری گولی اس وقت کے لئے تھی صاحب جب بگھیرا ہوا میں چھلانگ لگا چکا ہوتا مگر مجھے کامل یقین تھا کہ آپ کی گولی ضرور چلے گی ۔“ میری گولی چلنے کا وقت ہی کہاں آیا تھا“

دراصل یہی خود اعتمادی اور بے خوفی تھی جس کی وجہ سے شکاریوں کو جان بچا کر خطرے سے بھاگنے کا خیال تک نہ آیا تھا ۔

ٹھاکر صاحب گاڑی پر بیٹھے بیٹھے شکار دیکھنے کے لئے بیتاب نظر آ رہے تھے اور اس بیتابی میں وہ گاڑی سے اتر پڑے اور اپنی بیساکھی کے سہارے چہل قدمی کرنے لگے تھے ۔ اُدھر ہم بچے بنگلے پر بیٹھے بیٹھے شکار کے متعلق ہی سوچ رہے تھے اور باتیں بھی کرتے جاتے تھے ۔ شام سے قبل ہی ہم پال پر

پہنچ گئے کھلیان سے آگے ٹیکری پر چڑھ کر آنے والی گاڑیوں کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ہی جنگل کی خاموشی میں موٹر کی آواز دور سے ہی سنائی پڑنے لگی جس نے انتظار کی بیتابی میں اضافہ کر دیا۔ آخر دیولاس کیمپ کا پہلا شکار ایک قد آور بگھیرا ہمارے سامنے تھا۔ فوٹو کھینچے جانے لگے شکار کو دیکھنے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

اس کیمپ میں ایک دل چسپ معاون مقامی آدمی واسی تھا جو ہم بچوں کی نگرانی پر مامور تھا اور "چترا با" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ٹھیٹھ دیہاتی ہوتے ہوئے بھی وہ ہم بچوں کے احساسات خوب سمجھتا تھا یہی وجہ تھی کہ ہم دو چار دنوں میں ہی چترا با کو پسند کرنے لگے تھے۔ وہ سارے دن ہمارے ساتھ رہتا اور ہمارے بچکانہ فطری تجسس کا مشاہدہ کرتا رہتا۔

ایک دن کیمپ سے بہت قریب پڑونا گاؤں سے بگھیرے کے شکار کے بعد جب شکار میں لگی گاڑیاں لوٹنے کو تھیں تو چترا با کافی آگے جا کر انتظار کرنے لگا اس کے تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ آیا اور ہمارے چھوٹے بھائی ریاض اور رضا سے کہنے لگا۔ اپنی بندوق تیار کر لو اور چلو۔ آپ کو شکار کے لئے بلایا ہے۔، سن کر دونوں بھائی اچھل پڑے۔ ہم بہنیں بھی ساتھ ہو لیں۔ بھائی اپنی ایر گن سنبھالے ہوئے تھے۔ چترا نے ہمیں کھلیان کے آگے سڑک کے موڑ پر کھڑا کر دیا۔ دونوں بھائیوں کو آگے بڑھا کر اشارے سے پاس کی جھاڑی میں بیٹھا بگھیرا

دکھادیا بندوق میں چھرے بھرنے کا دکھاوا کرتے ہوئے اس نے ائیر گن کا محض اسپرنگ چڑھادیا اور بھائی ریاض کے ہاتھ میں تھما کر نشانہ لگانے کا اشارہ کیا۔ پھر کیا تھا ننھے شکاری نے بڑے انداز سے ایک آنکھ دبا کر نشانہ سادھا لبلبی دبائی پٹاخہ چھوٹا اور وہ خوشی سے دوہرے ہو گئے۔ دوسری گولی رضا میاں نے چلا دی۔ اس کے بعد دونوں آپس میں تکرار کرنے لگے کہ میری گولی سینے میں لگی ہے۔ دوسرے نے کہا میری سر پر لگی ہے۔

پہلے بڑے شکار کے بعد دو ہفتے میں سات بگھیرے شکار کر لئے گئے تھے۔ اس لئے ٹھاکر صاحب نیز دیگر لوگوں کے اصرار کے باوجود باپو نے مزید بگھیرے کا شکار کرنے سے انکار کر دیا۔ ہاں کیمپ پھر جاری رہنے کی تجویز کو وہ نہیں ٹال سکے۔ لہٰذا باقی ایام سیر و تفریح میں گذرے۔ یوں تیتر بٹیر کا شکار ہانکے کے ذریعے ہی ہوتا رہا۔ بیٹھے ہوئے پرندے کو نشانہ بنانا بھی باپو کو پسند نہیں تھا کیوں کہ یہ ان کے مطابق شکاریا (spault) کی تعریف میں نہیں آتا چنانچہ پہلے پیڑ پر بیٹھے پرندوں کو اڑا دیا جاتا اور پھر میدان میں کھڑے ہوئے شکاری انھیں ان کی پرواز کے دوران نشانہ بناتے۔

کیمپ کے مقابل ہی ایک چھوٹا پہاڑی سلسلہ تھا جو ننشہ مگرا کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے ڈھلان پر ایک درے میں بگھیرے کا ایک جوڑا مقیم تھا۔ کیمپ کے پہلے ہفتے میں ہی اس درے کو دریافت کر لیا

تھا دونوں جانور رات کو ڈکارتے ہوئے اس پہاڑی پر گھومتے رہتے تھے۔
انھیں پہاڑی سے اترتے چڑھتے بھی دیکھا گیا تھا۔ بنگلے کی چھت سے بغیر دوربین
کے ڈھلان پر علی الصبح اس جوڑے کا نظارہ بڑا ولولہ انگیز معلوم ہوتا تھا۔ شاید
اسی لئے اس جوڑے کے لئے شکاریوں کے دل میں دوستانہ جذبہ پیدا
ہو گیا تھا۔ اس لئے انھیں شکار کرنے کی ہر تجویز مسترد ہوتی رہی۔ ایک دن
دیکھا گیا کہ صبح صبح ہی کیمپ کے سامنے جہاں ہمارے مہمان احمد علی اور دوسرے
افراد چارپائیوں پر سوتے تھے وہاں چارپائیوں کے درمیان بگھیروں کے
پنجوں کے واضح نقوش دیکھے گئے جنھیں دیکھ کر ہر آدمی چونک پڑا۔ یہ واقعہ
کافی اہمیت کا حامل تھا کہ رات کو خوابیدہ لوگوں کے قریب آکر بھی یہ خطرناک
درندے بنا گزند پہنچائے لوٹ گئے۔

دیل واس میں دس ہفتوں کے قیام کی یہ روداد ادھوری رہ جائے گی
اگر اس میں مہادیو مندر کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ مندر ہماری قیام گاہ سے میل بھر
دور تھا جہاں صرف پیدل چلنے کا ہی راستہ تھا۔ راستے کا کچھ حصہ جنگل کے درمیان
گہرے سبز پتوں سے پٹا ایک سائبان نظر آتا تھا۔ راستے میں شہد کی مکھیوں کی بھن
بھن اور طاؤسوں کی ماؤ ماؤ سنائی پڑتی تھی۔ دیو قامت درختوں کے سائے میں
کھڑے ہو کر ایک انوکھی دنیا میں ہونے کا احساس جاگزیں ہو جاتا تھا۔ درختوں پر
بے شمار بندران کی کلکاریاں، طاؤسوں کی اٹھکھیلیاں، گولر املی آم کے کھٹے میٹھے

پھلوں کی مہک درمیان سے گذرتا ہوا ٹھنڈے پانی کا چشمہ اِن سب کے ساتھ اس سبز سائبان میں پتھر کے شنکر مہادیو یہ سب ایک خواب کی دنیا ہی تھی اس دنیا کے محسوسات کی ترجمانی لفظوں میں نہیں کی جاسکتی۔ ایک دفعہ یہاں آنے کے بعد اس منظر نے ہم بچوں پر ایسا جادو کیا کہ ہم بھری دوپہر میں بڑوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر اس مقام کی جانب چل پڑتے تھے اور ہمیں غائب پاکر چترا بادو سرے لوگوں کو ساتھ لے کر ہمیں تلاش کرنے نکل پڑتے تھے۔ اور وہ لوگ بھی ہمیں کبھی راہ سے بھٹکے ہوئے کبھی اُلّو کا بچہ پکڑے ہوئے اور کبھی لومڑی یا گیدڑ دیکھ کر سہمے اور گھبرائے ہوئے پایا کرتے تھے۔

یہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کا زمانہ تھا۔ بارش دھواں دھار ہو رہی تھی۔ ایک دن صبح میں ایک نہایت الم ناک خبر ملی جسے سن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور آنکھیں نم ہو گئیں۔

جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا ہے کہ ٹھاکر صاحب نے نالے کو باندھ کر دیولاس جھیل بنائی تھی۔ کیمپ کے خاتمے کے بعد سے ٹھاکر صاحب کا زیادہ وقت دیولاس کے بنگلے میں ہی گذرنے لگا تھا۔ اب کی برسات کے موسم میں وہ اسی جھیل کے منظر سے محظوظ ہونا چاہتے تھے جسے انھوں نے حال ہی میں اتنے شوق و ارمان سے بنایا تھا۔

اس شام وہ بنگلے پر ہی مقیم تھے ایک دوست بھی ساتھ تھے۔ دن بھر بارش ہوتی رہی جو شام کو تھمی تھی ٹھاکر صاحب ٹہلنے کے لئے پال پر آئے

تھے کہ چناو دے کی جانب سے پہاڑ کی طرح بلند پانی کا ریلا اٹھتا ہوا نظر آیا۔ یہ
خطرہ دیکھ کر انھوں نے فوراً وہاں موجود ملازموں کو مٹی کی بلند دیوار کو کاٹنے کی
ہدایت کی تاکہ اس سیلاب کو نکل جانے کی راہ مل جائے ۔ مگر دیر ہو چکی تھی یہ
سیلاب جیل میں داخل ہو چکا تھا دیکھتے دیکھتے ہی پانی اُبل کر پال سے اوپر نکل
آیا تھا اب کارندے ایک جانب تھے اور ٹھاکر صاحب دوسری جانب درمیان میں
پانی تھا جو دیوانے ہاتھی کی مانند بپھر رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب اور اُن کے دوست آخر
کسی طرح بنگلے کی چھت پر چڑھ گئے ملازم گاؤں کی جانب دوڑ پڑے اور لوگوں
کو اکٹھا کر لائے لیکن تب تک صورت حال قابو سے باہر ہو چکی تھی پانی میں پھنسے
ہوؤں کو بچا لینا اب امکان سے بعید ہو چکا تھا۔ اب یہ سب ناچار نرغے میں
پھنسے ہوئے ٹھاکر اور ان کے ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے ۔ ذرا دیر میں پانی نے بنگلے
کے درمیان کی ایک بلندی کو کاٹ دیا جس سے بنگلے کا ایک گوشہ بھی ڈھے گیا
اس کے بعد جلدی جلدی ہر دیوار گرتی چلی گئی ۔ بنگلے کے پناہ گزیں پیچھے ہٹتے
گئے یہاں تک کہ چھت کا آخری سالم حصہ بھی چار خوفزدہ اور سراسیمہ افراد کو لے
کر پانی کی گہرائیوں میں جا گرا اور دیکھنے والے ہاتھ ملتے آہ وزاری کرتے رہ گئے
برساتی شام کی بڑھتی تاریکی نے گہرا ہو کر رات کو مزید ہولناک بنا دیا
اس مہیب تاریکی میں آخر سب لوگ مایوس ہو کر بھاری قدموں سے گھروں
کو لوٹ گئے۔ اگلے دن صبح ہی لوگ پھر ان چاروں بدنصیبوں کا انجام معلوم

کرنے نکل پڑے تھے ۔ ٹھاکر صاحب کے دوست کا بے جان جسم قریب ہی مل گیا۔ دو ملازم برگد کی مضبوط شاخیں گرفت میں آجانے سے بچ گئے تھے مگر دونوں ایک پیڑ پر ایک دوسرے کی موجودگی سے بھی بے خبر رہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا علم اس وقت ہوا جب مدد کو آتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر اُن کے منھ سے آواز نکلی ۔ افسوس ٹھاکر صاحب کا ابھی کہیں پتہ نہیں تھا ۔ حالانکہ وہ ماہر تیراک تھے لہٰذا لوگوں کو ان کے بچ نکلنے کی امید تھی ۔ اس امید و یاس میں سارا گاؤں انھیں برابر تلاش کرتا رہا مگر شام تک کوئی سراغ نہیں ملا ۔ دوسرے دِن بھی تلاش جاری رہی آخر کار گاؤں سے چھ سات میل دور ایک درخت کے تنے کے ساتھ بل کھائے لپٹے مردہ ٹھاکر مل گئے اور ٹھاکر صاحب کو زندہ دیکھ پانے کی موہوم امید نے دم توڑ دیا۔ ایسے غیر متوقع الم ناک موڑ پر دیہاتوں کی تعمیر و ترقی کے کئی منصوبے ٹھاکر کے ذہن میں پل رہے تھے جنھیں ساتھ لیئے وہ قبل از وقت ہی دنیا سے رخصت ہو گئے ۔

سیلاب کی اس آفتِ ناگہانی سے نہ کھیت بچے تھے نہ کھلیان نہ باغ بچا نہ وہ مختصر بنگلہ جس میں ہم لوگ کچھ ہفتے قیام کر اپنے گھر لوٹ آئے تھے مگر لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ تھے کہ بنا تعمیرات یا انجینئرنگ کی تربیت و سند کے ٹھاکر نے جو باندھ کھڑا کیا تھا وہ اس میں سمائے ہوئے پانی کو اپنے حلقے میں لیئے سالم کھڑا تھا۔ سیلاب کا پانی اُس سے بلند ہو کر اوپر سے ضرور گذر گیا مگر اُسے پامال نہ کر سکا۔

بگھیروں کی شورش

یہ واقعہ آزادی کے فوراً بعد یعنی ۱۹۴۸ کا ہے جب راجستھان کے اولین وزیراعلیٰ مانک لعل ورما تھے اور ان کے پاس امبیری کے قرب و جوار کا ایک نمائندہ وفد اپنے علاقے کی فریاد لے کر پہنچا تھا ــــ کوئی کہتا تھا کہ گھر میں کھانے کو نہیں رہا اگلی فصل کہاں سے بوؤں گا جب کہ مویشی ہی نہیں رہے دوسرا کہتا، حضور کتنی مشکل سے پیٹ کاٹ کر دو ہزار روپیہ جمع کر کے چھ ماہ پہلے ہی تین مویشی خریدے تھے سوچا تھا کہ اب گھر میں آٹے دھان کی کمی نہیں رہے گی مگر قسمت پھوٹ گئی بس ایک گائے بچی ہے گائے تو کھیت ہانک نہیں سکتی۔ اس طرح سب لوگوں نے اپنی اپنی بپتا سنائی۔ سب کی سن کر وزیراعلیٰ نے تسلی دی کہ یہ مسئلہ جلد ہی حل کیا جائے گا۔

وفد کی واپسی کے بعد ورما صاحب کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کس طرح یہ مسئلہ حل ہو سکے گا۔ لیڈروں اور سوشل ورکروں وغیرہ کے بس کی تو یہ بات تھی نہیں

اور نہ کوئی انجینیئر ٹیکنیشن اسے حل کر سکتا تھا وزیر اعلیٰ کے پرائیویٹ سیکریٹری مرحوم نرنجن ناتھ آچاریہ کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے خود ہی اس مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری لی۔

دراصل باپو آچاریہ جی کے قریبی دوستوں میں تھے اور آچاریہ جی یہ بھی جانتے تھے کہ تحسین صاحب ماہر شکاری ہیں۔ لہٰذا انھیں یقین تھا کہ یہ مسئلہ ان کے تعاون سے ضرور حل ہو جائے گا۔

آخر باپو کے پاس وزیر اعلیٰ کا پیغام پہنچا جس میں ان سے امرکھ جی کے جنگل سے بگھیروں کی دہشت گردی ختم کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔ صورت حال کافی پیچیدہ تھی پروہت جی کے تالاب کے گرد متعدد بگھیرے جمع ہو گئے تھے جو گاؤں میں داخل ہو کر پے در پے مویشیوں کی جان لے رہے تھے۔ اصل میں اس صورت حال کے دو بڑے سبب تھے۔ اول تو اس جنگل میں بگھیروں کی خوراک کے لئے جانوروں یعنی جنگلی چرندوں کا فقدان ہو گیا تھا دوسرے کئی بگھیرے یکجا بھی ہو گئے تھے۔

جب ہرن چکارے وغیرہ نہیں ملتے تھے تو مجبوراً وہ گاؤں کی طرف لپک جاتے تھے۔ کام جوکھم کا تھا مگر باپو نے غور و خوض کر کے اس مہم کو سر کرنے کا اقرار کر لیا اگلے دن ہی جب وہ متاثرہ علاقے میں پہنچے تو پہلے وہاں کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا اور پورے حالات معلوم کئے۔ معلوم ہوا کہ روزانہ چار پانچ مویشی مارے جا رہے ہیں جنگل کا رقبہ تقریباً ۳ × ۱۰ تھا جس میں بگھیروں

کا جماؤ تھا۔ چرواہے خوف سے جانوروں کو چرانے نہیں لے جا سکتے تھے۔ بیلوں کی کمی آجانے سے آدھی زرعی زمین میں ہنکائی کا کام نہیں ہو پایا تھا۔ باپو اس جنگل سے بخوبی واقف تھے انھوں نے جنگل میں گھس کر جائزہ دیئے بغیر ہی اپنا ایکشن پلان بنا لیا۔ اور لوگوں کو ڈھارس بندھائی کہ انتظام ہو جائے گا۔

گاؤں والوں کو متنبہ کیا گیا کہ انھیں جہاں بھی بگھیروں کے ہاتھوں ہلاکت کا نشان ملے وہ اودے پور آکر اس کی اطلاع دیں اور کئے ہوئے شکار کو پتوں وغیرہ سے ڈھانک دیں تاکہ وہ گِدوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔

موضع امیری اودے پور سے چھ میل دور ہے لہٰذا کیمپ لگانے کی ضرورت نہ جان کر اودے پور کو ہی ہیڈ کوارٹر رکھا گیا۔ شکار کا پہلا دن تھا برسات کی تاریک رات تھی۔ شام سے قبل ہی باپو جنگل میں پہنچ گئے جہاں دو پہاڑیوں کے درمیان نالے میں ایک ضعیف بیوہ کی گائے کا 'کھچ' پڑا تھا۔ دن ڈھلتے ہی چرتی ہوئی گائے کو بگھیرے نے مار دیا تھا۔ ضعیفہ خود پیدل چل کر اودے پور پہنچی تھی۔ اس نے باپو کو اپنے بڑھاپے کے سہارے یعنی اس گائے کی ہلاکت کا اس طرح گڑگڑا کر بیان کیا تھا کہ سننے والے آبدیدہ ہو گئے تھے۔

جس ڈھلان پر باقی ماندہ گائے پڑی تھی اس کے پاس کوئی محفوظ مقام یا درخت نہیں تھا جہاں کے مچان بنایا جا سکتا۔ اور نہ یہ جگہ ہانکا لگانے کے لائق تھی۔ مجبوراً کچھ نشیب میں جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بیٹھنے کا بندوبست

کرنا پڑا اب سوال یہ تھا کہ وہاں کون کون ساتھ بیٹھے جو کہ فاضل بندوقوں کو تھامے رہے ۔ سارے دیہاتی اس سوال پر ڈر کی وجہ سے خاموش تھے اور ایک دوسرے کا منھ دیکھتے تھے مجبوراً باپو نے تنہا ہی بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا ۔ گائے کے کھمبے سے پتّے ہٹا دیئے گئے تھے ۔

دیہاتی باپو کو تنہا چھوڑ کر لوٹ ہی رہے تھے کہ اُن کا ایک شکاری کھوجیا دوڑا ہوا آیا ۔ "آپ کے آنے کا سماچار سن کر کوس بھر سے دوڑا آ رہا ہوں آپ نے کیوں مجھے یاد کیا ؟" اس کا اصرار تھا کہ وہ باپو کے ساتھ بیٹھے گا باپو نے اسے سمجھانا چاہا کہ جگہ خطرناک ہے ایک جگہ دو جانیں جوکھم میں ڈالنا مناسب نہیں ہوگا مگر جینیا نہیں مانا دوسری بندوق آخر اسی کے حوالے کر دی گئی باقی افراد کو ہدایت کی گئی کہ وہ اونچی آواز سے گفتگو کرتے ہوئے گھاٹی سے اوپر چلے جائیں تاکہ اگر کوئی بگھیرا آس پاس ہو تو یہ سمجھے کہ اب مردہ گائے کے پاس کوئی بھی نہیں ہے ۔ لہٰذا باقی افراد چار پانچ سو گز دور محفوظ مقام پر چلے گئے دونوں شکاری اپنی کمین گاہ میں ساکت بیٹھ گئے اندھیرا ہونے کے بعد نم زمین میں دبکے ہوئے مچھروں نے اُن شکاریوں پر بے دریغ حملہ بول دیا اور ان کی مجبوری کا جی بھر کر فائدہ اٹھاتے رہے ۔

سناٹا چھایا تھا جھینگر اور مینڈکوں کی آوازوں نے سناٹے کو زیادہ ہی بوجھل بنا دیا تھا ۔ ہوا ساکت تھی اس لئے درختوں کے پتّے بھی گویا محو

خواب تھے فقط دو شخص بمعہ بندوق اس سناٹے میں بہ کمال ہوش نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ خاموش اور مستعد بھی بیٹھے ہوئے تھے ساتھ ہی بگھیرے کی آہٹ کے لئے ہمہ تن گوش بھی تھے ۔ ایسے میں ایک چالاک بگھیرا نہ جانے لب مردہ گائے تک پہنچ گیا تھا جس کا اندازہ شکاریوں کو نہیں ہو سکا تھا بارش کے سبب خشک پتے بھی نرم ہو گئے تھے اس لئے چرمراہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔

چوکنے کانوں نے دفعۃً گوشت نوچے جانے کی آواز سُنی اس لئے فوراً ہی شکاری نے رائفل سنبھالی دھیرے سے کندھے لگائی اور بیرل پر کلیمپ سے فٹ ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ روشنی میں ایک قد آور بگھیرا دکھائی دے رہا تھا جس کے منہ میں گوشت کا بڑا ٹکڑا تھا۔ تاریکی میں وہ اپنے پسندیدہ کھانے کا لطف لے رہا تھا۔ شکاری اس سے ۴۰ فٹ کے فاصلے پر تھے۔ باپو نے آخر نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ دھماکے نے جنگل کا سکوت برہم کر دیا بگھیرا اپنے مقام سے اچھلا چھلانگ لگا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ پہاڑی نالے میں گویا بونڈلا آ گیا تھا۔ بندوق کی آواز خاموش ہوئی تھی کہ زخمی بگھیرے کی دھاڑ گونجنے لگی مگر کچھ لمحوں بعد یہ طوفان بھی تھم گیا اور پھر سکوت ہو گیا۔ کچھ دیر تک مردہ گائے کے آس پاس روشنی کا دائرہ گھوما کیا مگر کوئی اس دائرے کی زد میں نہیں آیا۔ تلاش جاری تھی کہ اچانک روشنی کے دائرے میں دو انگارے سے چمکے مگر نشانہ لینے سے قبل ہی غائب ہو گئے۔

گھاس اس قدر بلند تھی کہ ٹارچ سے بگھیرے کو تلاش کر لینا ممکن نہیں تھا

مگر کوشش ضرور ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہی انگارے پھر دہکے اور بجھ بھی گئے۔ ایسا لگا کہ جانور نے گردن اٹھاکر دیکھا اور دبک گیا۔ باپو نے دونوں آنکھوں کے درمیان گولی داغنی چاہی مگر یہ آنکھ مچولی اس کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔

جیوں جیوں وقت گذر رہا تھا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ زخمی جانور کو اتنا وقت مل جانا خطرناک بات تھی۔ مجبوراً باپو نے ان آنکھوں کے رخ سے ہی جانور کے وجود کا اندازہ کرتے ہوئے متواتر دو فائر کئے۔ گولیوں کی آواز ختم جانے کے بعد پھر خاموشی چھا گئی جس سے باپو کو یقین ہونے لگا کہ بگھیرا مر چکا ہے۔ مگر دو گولیوں کے جواب میں مقابل سے کوئی سرسراہٹ بھی نہ ہونا باعث فکر تھا۔ جنگل کے سناٹے میں باپو کے ذہن میں ایک ہیجان اُٹھ رہا تھا وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے کہ ٹھیک اس جگہ دو آنکھیں پھر چمکتی ہیں اور اگلے لمحے غائب ہو جاتی ہیں۔ دراصل یہ بڑی ہی غیر متوقع اور تشویش ناک صورت حال تھی۔ نہایت پس وپیش کی گھڑی تھی کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو جانے کا پورا اندیشہ ہو چکا تھا۔

اُدھر متواتر فائروں کی آواز سے سرحد پر منتظر دیہاتی اس صورت حال سے بہت گھبرا گئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہے تھے لہٰذا انھوں نے چیخ چیخ کر شکاریوں کو پکارنا شروع کر دیا مگر اس جانب سے انھیں کوئی جواب نہیں مل

رہا تھا ملتا بھی کیسے۔ شکاری خود کو ایسے خطرناک حالات میں پا رہے تھے کہ انھیں اپنی سانس بھی بھاری معلوم ہو رہی تھی کہ کہیں سانس کی آواز ہی بگھیرے کو ان کی ٹوہ نہ لگا دے قد آدم گھاس ہی انھیں بگھیرے کی نگاہ سے بچاتے ہوئے تھی۔ ٹارچ کی محدود روشنی اور آنکھوں کے درمیان ہی یہ سارا کھیل چل رہا تھا۔ شکاریوں کے پاؤں اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ ناچار باپو نے فیصلہ کیا اگلی بار آنکھوں کے چمکتے ہی ان کے درمیان فوراً گولی داغ دی جائے۔ ذرا دیر میں ہی آنکھیں چمکیں اور باپو نے بہ سرعت گولی چلا دی۔ کوئی غراہٹ نہیں ہوئی۔ محض کسی چیز کے گھسٹنے کی آواز آئی جس نے خطرے میں مزید اضافہ کر دیا۔ الجھن اور بڑھ گئی۔ یا تو بگھیرا ہلاک ہو کر ڈھلان سے لڑھکا یا وہ زخمی ہو کر گھسٹتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ ٹارچ کی روشنی میں پھر بغور جائزہ لینا پڑا اور کچھ لمحوں بعد شکاریوں کو یہ جان کر ڈھارس بندھی کردہ دہکتے ہوئے انگارے اب بجھ چکے ہیں۔ اور آنکھ مچولی اختتام کو پہنچ گئی یعنی بگھیرا اب اس مقام پر نہیں تھا۔ پھر بھی الجھن ختم نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ بگھیرا آخر کہاں تھا اور اس کا کیا ہوا؟ اس صورت میں اب خطرہ اٹھائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ یعنی اس مقام سے جنگل پار کر کے واپس ہونے میں ہی خیریت تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ لوٹا کیسے جائے؟

شکاری نشیب میں تھے اور بگھیرا بلندی پر اس حقیقت سے تو واقف تھے کہ زخمی درندہ چڑھائی نہیں چڑھتا وہ لازمی طور پر ڈھلان کی جانب آئے گا

یعنی خود امنیں کی طرف۔ ۔ ۔ وہاں سے نیچے اترنے کا ایک ہی راستہ تھا جہاں سے شکاریوں کو باہر نکلنا تھا۔ ۔ پھر کیا کیا جائے۔ ۔ ۔ اتنی گھنی جھاڑیوں کے درمیان تو کہیں بھی اس بگھیرے سے مڈھ بھیڑ ممکن ہی نہیں یقینی تھی اور اس تصور سے ہی جی کانپتا تھا۔

آخر پاس بیٹھے جیتیا نے باپو کو اشارہ کیا کہ عقب والی پہاڑی چڑھ کر دوسری جانب سے نیچے اترا جائے واقعی اس کے علاوہ اور کوئی راہِ فرار نہیں تھی باپو یہ بخوبی جانتے تھے۔ ۔ ۔ اب نالے کو پار کرنا اور اپنے مقام پر موجود رہنا یکساں طور پر خطرناک تھا۔ سوچنے کے لئے زیادہ وقت بھی نہیں تھا لہٰذا باپو اسی سمت روانہ ہو گئے اور جیتیا ان کے پیچھے ہو لیا۔ ٹارچ کی روشنی میں پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جیتیا کا حوصلہ جلب دے رہا تھا مگر باپو کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ۔ یکایک اس کے جسم سے جان نکلتے نکلتے رہ گئی جب اسے یہ احتمال ہوا کہ زخمی بگھیرے نے اس کی ٹانگ پکڑلی ہے حالانکہ اس کے پیر پر ایک مینڈھک پھدک گیا تھا۔ تاہم خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی کیوں کہ ذہن پر زخمی بگھیرا ہی مسلط تھا۔ اس گھبراہٹ میں اس نے چھلانگ بھری تو بندوق جو اس کے ہاتھ میں تھی وہ گرفت سے نکل کر جھاڑیوں میں گر کر اس تاریکی میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ باپو نے جیتیا کو سنبھالا۔ ایک ہاتھ میں اپنی بندوق لے کر دوسرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ۔ تقدیر نے اس رات دونوں کا پورا ساتھ دیا تھا۔ دونوں بنا کسی

خطرے سے دوچار ہوئے محفوظ گھاٹی پار کر گئے تھے اور چڑھائی چڑھنے لگے تھے۔ اب ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں ٹھوکر کھا کر گہرائیوں میں نہ لڑھک جائیں۔ تاہم کسی طرح حوصلے اور ہوشیاری کے بل بوتے ایک گھنٹے میں چڑھائی چڑھ کر دونوں دوسری جانب اتر چکے تھے۔

اُدھر انتظار میں بیٹھے ہوئے دیہاتی اب مایوس ہو کر لوٹ جانا چاہتے تھے مگر پہاڑ پر روشنی دیکھ کر اچھل پڑے اور تلہٹی تک دوڑے چلے آئے۔ دونوں ساتھیوں کو صحیح وسلامت پا کر خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ کچھ لمحوں بعد سب ہی جیپ کی جانب روانہ ہوئے جو وہاں سے میل بھر کے فاصلے پر تھی۔

نصف شب کا وقت ہو گیا تھا باپو نے لوگوں کو ہدایت دی کہ گاؤں بھر کو بگھیرے کے زخمی ہو کر غائب ہو جانے سے باخبر کر دیا جائے تاکہ ایسی حالت میں علی الصبح کوئی جنگل میں داخل نہ ہو اور باپو کی آمد کا انتظار کریں۔ طلوع آفتاب سے قبل باپو گاؤں پہنچ گئے کیونکہ انھیں دیہاتیوں سے تنبیہ کے باوجود اندیشہ تھا۔ ذرا دیر بعد باپو ایک آدمی کو ساتھ لے کر بگھیرے کی تلاش میں نکل پڑے۔

پہاڑی کے ڈھلان سے اوپر چڑھ کر دیر تک چاروں طرف نظر دوڑائی گئی مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ لہٰذا نیچے اترنا پڑا رات والے مقام پر اونچائی سے نیچے پھر جھانکا مگر گھنی جھاڑیوں میں زمین نظر نہیں آتی تھی۔ آخر باپو بڑے احتیاط سے نیچے اترنے لگے اور مردہ گائے کے قریب پہنچے لیکن وہاں کچھ نہ ملا

زخمی بگھیرے کے امکانی حملے کا بھی اندیشہ لاحق تھا لہٰذا جھاڑیوں میں گھسنا دانشمندی نہیں تھی۔ تلاش کرنے سے باپو کو گائے کے قریب گھاس اور پتی پر رگڑ کھانے اور گھسٹنے کے نشانات نظر آ گئے جن کا سلسلہ ایک چٹان کی سمت تھا۔ اُدھر بڑھ کر جو نگاہ کی تو اس کی اوٹ میں ایک گڈھا نظر آیا جس میں بگھیرا ابدی نیند سویا ہوا تھا۔ رات بھر پریشان اور ہراساں کرنے والا معمہ اب جا کر موقعہ واردات پر حل ہو سکا۔

گذشتہ رات کے واقعات پر نظر ثانی کرنے پر حقیقت افشا ہوئی۔ جن متواتر فائروں نے سب کو تشویش میں ڈال دیا تھا وہ دراصل بگھیرے کو لگے ہی نہیں بلکہ چٹان سے ٹکرا کر ضائع ہو گئے تھے اس چٹان کو تاریکی میں باپو نے بگھیرے کا سراپا سمجھ لیا تھا جب کہ چٹان کی آڑ سے آنکھ مچولی کر رہا تھا۔ گھسٹنے والی آواز بھی اس کی نہیں تھی بلکہ وہ گولی کے بعد اس کے گڈھے میں پھسل جانے کی آواز تھی۔ اس کو صرف دو گولیاں لگی تھیں۔ پہلی گولی سے زخمی ہو کر اس نے چٹان کی آڑ لے لی تھی لیکن دوسری اس کی پیشانی پر لگی جس نے اسے گڈھے میں لڑھکا دیا تھا۔

بہرحال مردہ بگھیرا مل جانے کے بعد جینتیا کے ہاتھ سے گری ہوئی بندوق بھی تلاش کر لی گئی۔ بگھیرے کو جب گاؤں میں لایا گیا تو اسے دیکھنے کے لئے پورا گاؤں جمع ہو گیا وہ بڑھیا بھی پہنچی جس کی اکلوتی گائے کو اس نے اپنا لقمہ بنایا

تھا۔ اس نے روتے ہوئے ایک بڑا پتھر اٹھا کر مردہ بگھیرے پر مارنا چاہا لیکن لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔

امرکھ جی کی شکار مہم میں یہ پہلا شکار تھا جس کے بعد پے در پے ایک دو دن میں سات بگھیروں کے شکار کے بعد یہ مہم اختتام کو پہنچی اور گاؤں والوں کو اس کے بعد بگھیروں سے نجات مل گئی۔

آدی واسی
شکاری اور دو بوری گیہوں

ضلع کے کولیاری ٹھکانے (جاگیر) کے راؤ صاحب کی معیت میں ہمارے باپو (تحسین صاحب) شکار کیمپ کے لئے روانہ ہی ہونے والے تھے کہ علاقے کے ایک بھیل نے ان کی راہ روک لی۔ جھک کر سلام کرتے ہوئے وہ کھڑا کھڑا مسکرا رہا تھا۔۔ باپو نے غور سے دیکھا مگر وہ اسے پہچان نہیں سکے۔۔ آخر کچھ دیر بعد وہ شخص کہنے لگا۔

"ٹوپا والا صاحب ہو۔آپ! ہیں کالو کٹارا۔۔۔ اوہ کالو باپو خوش ہو کر بولے۔

کچھ مزید گفتگو کے بعد جب باپو روانہ ہونے لگے تو بھیل نے درخواست کی۔ "دو بوری گیہوں لایا ہوں ہجور بچوں کے لئے لے پدھارو!"

دو بوری گیہوں تو کہاں سے لایا کالو۔۔ رہنے دے۔ تیرا کہنا ہی میرے لئے دینے کے برابر ہے۔" باپو نے جواب دیا۔ مگر کالو کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ

لجاجت سے کہنے لگا۔

"ایک جگ پہلے کے دن اب نہیں ہیں صاحب۔ ان دنوں آپ ہی نے ہمارے من میں جوت جلائی تھی جس کا اجالا ہم آج دیکھ رہے ہیں"۔ وہ اپنی مقامی زبان میں بول رہا تھا "یہ دیس آجاد نہیں کہلاتا اگر ہم آجاد نہیں ہوتے ہجور" دھنیہ ہو وہ لنگوٹی دھاری سنت دھنیہ ہو۔۔ "یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

باپو کے حافظے میں کچھ ماضی کے واقعات تازہ ہو گئے۔۔ وہ زمانہ اور تھا جب آزادی، جمہوریت تھی نہ سماج واد تھا۔ وہ دن تھے ظلم ناانصافی اور جبر کے۔ ریاست میواڑ میں سولہ بڑے اور تیس چھوٹے جاگیر دار ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور چھوٹے موٹے کئی ٹھکانے بھی تھے۔ سولہ بڑے سولہویں امرا اور ۳۲ چھوٹے بتیسے کہلاتے تھے۔۔ کالوکٹارا ایک بتیسے جاگیر دار کی ادنٰی رعیت میں سے تھا۔ اس جاگیر دار کو راجہ رانا کا خطاب بھی ریاست نے دے رکھا تھا۔ یہ جاگیر ایک جنگلی اور پہاڑی علاقے پر مشتمل تھی جہاں پہنچنے کے لئے پیدل یا گھوڑے پر جانا پڑتا تھا۔

یہ راجہ رانا دربار کی حاضری اور دیگر کاموں کے لئے اودے پور آیا جایا کرتے تھے۔ باپو اس دور میں اودے پور ریاست کے لئے اسلحہ وضروریات اسلحہ (Arms & Ammunation) کے اجارہ فروش (Monopoly Dealer) تھے

لہٰذا وہ بندوق اور کارتوس کی خرید کے لئے باپو کے پاس بھی آتے رہتے تھے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ تحسین صاحب محض بندوقوں کے سوداگر ہی نہیں شکار کے ماہر بھی ہیں تو انھوں نے باپو سے دوستانہ راہ و رسم پیدا کر لی۔ دھیرے دھیرے یہ گہرے ربط میں بدل گئی۔

اب جب بھی راجہ رانا صاحب باپو سے ملتے یہی فرمائش کرتے۔ میرے جنگل میں شکار کے لئے آؤ!۔۔ ۳۰۔ ۳۵ میل پہاڑی علاقہ پار کر کے اس جاگیر میں پہنچنا بڑی ٹیڑھی کھیر تھی لہٰذا باپو اس فرمائش کو کسی طرح ٹالتے رہتے تھے۔ لیکن راجہ رانا ضد پر اڑ گئے۔ یہاں تک کہ باپو کو آخر ہاں ہی کرنا پڑا۔

مقررہ دن چھ گھوڑوں کے ساتھ راجہ رانا کے آدمی اودے پور سے باپو کو لینے کے لئے آ پہنچے۔ باپو بتلاتے ہیں کہ ۳۰۔ ۳۵ میل کا دشوار گزار سفر ان افراد نے پیدل ہی طے کیا۔ یقین نہیں آتا کہ اتنا طویل پہاڑی فاصلہ گھوڑوں کی لگام تھامے چڑھتے اترتے وہ کس طرح طے کر پائے تھے۔ کیا وہ انسان نہیں کچھ اور تھے۔۔؟ اس کے جواب میں باپو نے کہا تھا۔۔ "ابھی سنا ہی کیا ہے۔ پوری بات سنو خود سمجھ لوگے۔" اگلے دن علی الصبح ایک باورچی اور چار آدمیوں کے ساتھ ٹھکانے کی جانب کوچ کر گئے۔"

"چلتے چلتے سویرے سے شام ہو گئی مگر منزل نہیں آئی۔۔ میرے پاس راجہ کا خاص چست اور تندرست گھوڑا تھا مگر پھر بھی راہ

میں ایسے مقام آئے کہ گھوڑا پیٹھ پر سواری لئے بلندی پر چڑھنے سے
معذور ہو جاتا تھا اور مجھے نیچے اتر جانا پڑتا تھا۔ آخر منزل آئی راجہ رانا
کارا ؤ لہ (محل سرا) کیا تھا جنگل کے ایک ٹکڑے کو صاف کر کے ایک
آرام گاہ بنا دی گئی تھی۔ اور اس کے گرد حفاظت کے لئے اونچی اونچی
دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں :

راجہ رانا کافی خوش تھے۔ نیند سے بوجھل آنکھوں سے وہ جھروکے سے شکاری
مہمانوں کو دیکھ رہے تھے جب قافلہ دروازے پر رُکا تو وہ نیچے آئے۔ باپو کے گھوڑے
کی پیٹھ سے زمین پر اترتے ہی رانا ان سے بغلگیر ہو گئے اور دیر تک سفر کی خیر و
عافیت معلوم کرتے رہے۔ جلد ہی مہمان خانے میں پہنچ کر رات کا کھانا کھانے
کے بعد تھکن کے سبب جلد ہی محو خواب ہو گئے۔

آفتاب کی شعائیں جاگ اٹھیں مگر سونے والے شعاعوں
سے اس وقت تک چشم پوشی کرتے رہے جب تک کہ مزید تکان
دور نہ ہو گئی اور کھانے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔ اٹھ کر ضروریات سے فارغ
ہوئے نہانے اور کھانے پینے کے بعد بھی اس دن کوئی کام سوائے آرام اور باتیں
کرنے کے نہیں ہوا۔

دوسرے دن راجہ رانا نے شکار کی کھوج خبر لانے کے لئے مقامی قبائل
بلوائے۔ متعدد اشخاص ہاتھ جوڑے آ کھڑے ہوئے۔ رانا نے انھیں مروڑ

پہاڑی پر شکار۔۔ کی معلومات کے لئے ہدایت دے کر بھیج دیا۔ نصف شب میں لمر سے روانہ ہو کر یہ لوگ پو پھٹتے پھٹتے مروڑ کی پہاڑیوں پر چڑھ چکے تھے۔ کئی منتخب مقامات پر بکھر کر بیٹھ گئے اور نیچے ڈھلان میں اپنی تربیت یافتہ ہوئی نگاہوں سے جنگل کا جائزہ لینے لگے۔ انھیں دراصل تیندوے، سور، ریچھ، سانبھر وغیرہ کی گذرگاہ کی ٹوہ لینی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے انھیں جانور نظر آنے لگے تھے جن کا ان کی نظریں تعاقب کرنے لگیں تاکہ ان کی مکین گاہ کا پتہ چل جائے۔ جن جن دروں میں جانوروں کی پناہ گاہوں اور ٹھکانوں کا پتہ چل گیا وہاں کچھ افراد تعینات کر دئے گئے اور باقی لوگ راناکو خبر پہنچانے راوالے لوٹ گئے۔۔ پہلی اطلاع سانبھر اور ریچھوں کے متعلق تھی۔ خبر ملتے ہی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

پہاڑوں کی چڑھائی پر ٹھنڈے پانی کے انتظام کے لئے کمہاروں اور شکار کی ہانک کے لئے بھیل قبائل کو ذمّے دار بنایا گیا انھیں وقت سے پہلے ہی اپنی ڈیوٹی سنبھال لینی تھی۔

شکار کا قافلہ روانہ ہو گیا دوپہر میں سنہری کرنیں گھنے سبز درختوں کی ٹہنیوں پتّوں سے پھسل پھسل کر زمین پر فرش ہو رہی تھیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجتی پہاڑی فضا سہمی سہمی سی لگتی تھی۔۔ دیر تک سفر جاری رہا۔ قافلہ جب تلہٹی میں پہنچ گیا تو گھوڑے پیڑوں سے باندھ دئیے گئے۔ کچھ لوگ ان کی

نگرانی پر لگا دیئے گئے اور باقی لوگ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔

دوپہر کی ہلکی ہلکی تمازت میں جنگل کی شادابی، پھلوں اور پھولوں کی نم آلود مہک سے شامل ہو کر ایک خوشگوار کیفیت پیدا کر رہی تھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹھنڈا پانی کے کوزے اور گھڑے لئے کمہار موجود تھے۔ اس پانی میں مٹی کی سوندھی سوندھی بو آ رہی تھی۔

پہاڑ کی چوٹی پر جاکر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دوسری جانب سپاٹ گھاٹی ہیں جنگل پھیلا ہوا ہے۔ جس مقام پر شکار کے لئے بیٹھنا تھا وہ ایک عمودی ڈھلان پر واقع تھا۔

راجہ رانا خود شکار نہیں کرنا چاہتے تھے ان کے پاس بندوق بھی نہیں تھی۔ مگر ان کے ایک مہمان جو خود شکار کھیلنے کے متمنی تھے انھیں باپو کے ہمراہ بیٹھا دیا گیا۔ باپو کے پاس دو رائفلیں تھی۔ ڈبل بیرل ۵۰۰ کو وہ خود تھامے ہوئے تھے اور دوسری بندوق وہی کالو کنارا سنبھالے ہوئے تھا جسکا ذکر اس قصے کی ابتدا میں ہے اور جو کہ باپو کو اسی دن سے پسند کرنے لگا تھا۔

شکاری اپنی اپنی جگہ لے چکے تھے لہٰذا ہانکنے والوں کو ہانکہ شروع کرنے کی ہدایت دے دی گئی۔ جنگل کی خاموشی میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ جھاڑیوں کے رگڑ کھانے اور پتھر کے لڑکنے کی آوازوں میں "ہرے" اور قسم قسم کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں کہیں تالیاں بجتی تھیں کہیں زمین پر لاٹھیاں پیٹی جا رہی تھی

اس معمول کے خلاف شور وغل میں جنگلی جانور اپنی آرام گاہ میں ٹھہر سکتے تھے۔
ہڑبڑا کر وہ باہر نکلے اور جدھر شور تھا اس کے مخالف سمت میں دوڑنے لگے۔
جب کے شکاری۔ اسی طرف ہی گھات لگائے بیٹھے تھے۔

پہلے سانبھروں کا جھنڈ سامنے آیا۔ راناکے مہمان ایک نیم خودکار رائفل لیئے
ہوئے تھے انھیں کے پاس سے وہ جھنڈ گذرا مگر وہ ایسی چوکڑی بھولے کہ ایک
ہی جانور پر متواتر کئی گولیاں داغ گئے جب کہ جانور کو فقط ایک ہی گولی ایسی لگی
کہ ٹانگ ہی مجروح ہوگئی ــــ ان غیر متوقع دھماکوں کا انجام یہ ہوا کہ سانبھروں
کا جھنڈ آگے نہ بڑھ کر واپس لوٹ گیا اور ہانکہ توڑ کر ہانکے والوں کو ہکا بکا کرکے
نرغے سے باہر نکل گیا۔ اس وقت سب لوگ اپنی اپنی جگہ سخت حیرت زدہ
تھے۔ ہانکے کے مہتمم کمال خاں کی تیوریاں چڑھیں مگر اپنا غصہ اتارنے کے لئے
کسی کو قریب نہیں پایا۔ اگر یہ گھاٹی پہاڑوں سے گھری نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ ہانک
والے خود بھی سانبھروں کے ساتھ ساتھ راہِ فرار اختیار کر لیتے۔ جب تین ٹانگوں
پر پھدکتا ہوا سانبھر فرار ہونے کی کوشش میں راجہ رانا کی نظر میں آیا تو انھوں
نے باپو کو اشارہ کیا اور باپو نے فوراً اس کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ - کچھ دیر کی
خاموشی کے بعد پھر ہانکے کا شور شروع ہوگیا۔ جس ڈھلان پر باپو تھے اُس سے
کافی قریب نیچے گذرتا ہوا ریچھ نظر آرہا تھا۔ اپنا قدرتی کالا کمبل اوڑھے ریچھ
کچھ اٹھلاتا کچھ سہما سا چل رہا تھا کیوں کہ ہانک کا شور اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

گھاٹی ڈھلان کے نیچے باپو کی نشست گاہ سے وہ تقریباً ڈیڑھ سو گز دور تھا کہ باپو کی بندوق چل گئی۔ دھماکے سے گھاٹی گونج اٹھی ساتھ ہی ہانک کا شور بھی ختم گیا۔ ریچھ اس کے بعد ایک قدم بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکا اور جہاں کا تہاں ڈھیر ہو گیا تھا گولی اس کی ایا لو میں سر اور گردن کے درمیان لگی تھی۔ ریچھ کا گرنا تھا کہ کمال خاں اپنی جگہ اچھل پڑا "واہ کیا گولی لگائی ہے" اس کے منہ سے نکلا تھا۔ راجہ کی آنکھیں بھی تعریف و خوشی کے جذبے سے چمک اٹھیں مگر کالو کٹارا حیرت زدہ اور خاموش تھا۔

کچھ لمحوں بعد جیوں ہی خیال ہوا کہ مردہ جانور کو اٹھا لینا چاہیئے کہ ریچھ کے جسم میں حرکت ہوئی۔ ظاہر ہے سب ہی چونک اُٹھے۔ دوسرے لمحے کیا دیکھتے ہیں کہ ریچھ کی پیٹھ سے کوئی ویسا ہی چھوٹا جسم پھسل کر نیچے آ گیا ہے جو کہ بلی کے برابر ہو گا۔ یہ ریچھ کا بچہ تھا اور نیچے آ کر وہ مردہ ریچھ کو نوچنے لگا تھا۔

اب ہانک اصل مقام سے بہت قریب تھی یعنی درمیان میں کوئی جانور نہیں تھا۔ باپو نے یہ ریچھ کا بچہ پکڑ لینے کا مشورہ دیا۔ رانا متفق ہو گئے مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ کیسے پکڑا جائے۔ آخر ایک چادر لے کر کچھ لوگ نیچے اترے اور قریب آ کر چادر اس پر ڈال دی۔ اس طرح اس کو اٹھا لیا گیا۔ یہی بچہ بعد میں راجہ رانا کے ہاں پلتا رہا جسے کچھ بڑا ہو جانے پر اودے پور چڑیا گھر میں پہنچا دیا گیا تھا

سب لوگ مطمئن اور خوش تھے۔ شکار بھی ہوا اور تفریح بھی۔ سانبھر اور ریچھ دونوں بلیوں پر ٹانگ لئے گئے تھے۔ باپو کے نشانے کی داد دی

جارہی تھی۔ ہاں کماں اس وقت نہ جانے کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ اب یہ قافلہ وہاں پہنچ چکا تھا جہاں کہ گھوڑے باندھے گئے تھے۔ کچھ دیر خاموشی ہی رہی شام ہوتی جارہی تھی پھر بھی واپسی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کماں کی رنگ بدلتی آنکھیں ضرور کسی بات کی غماز تھیں۔۔ مگر کس کی؟ ۔۔ باپو نے اس کے قریب جاکر کہا، بھائی چلتے کیوں نہیں ہو؟ بس صاحب ابھی چلتے ہیں۔ ذرا ہانک والوں کو آجانے دیجیے"۔ مگر اس جواب سے باپو کو اطمینان نہیں ہوا۔۔ ضرور کچھ چھپایا جارہا تھا۔

وہ لوگ تو بعد میں پیچھے آجائیں گے ہمیں تو روانہ ہوجانا چاہئے، باپو کا اصرار تھا۔ ؛ مگر کماں خاں چپ رہا۔ راجہ رانا بھی خاموش تھے اور روانگی سے گریزاں تھے۔ کماں خاں بات ٹالتے ٹالتے بڑبڑایا۔" انھیں تو ابھی پانتئے بیٹھانا ہے" پانتئے بٹھانا؛ یہ کیا ہے۔ سوال باپو کے ذہن میں کلبلایا۔۔ سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

کماں خاں بے چین سا تھا اور ٹہلنے لگا تھا۔ جنگل سے بانس بھی کاٹ کر منگوائے گئے جو کہ وہاں رکھے ہوئے تھے۔۔ کچھ لوگ بھی آچکے تھے جنھیں لائن میں بیٹھایا جارہا تھا۔

نہ معلوم کیوں وہ لوگ سہم اور کانپ رہے تھے۔۔ اپنے جسم کو گٹھری بنائے ہوئے وہ کماں خاں سے نگاہیں چرا رہے تھے۔۔ کچھ وقت یوں ہی گذر گیا۔ جب تمام لوگ نہ آئے تو کماں خاں غرّایا۔۔ اس کی آنکھوں سے

شعلے نکلنے لگے۔ اس نے ہانکے کے میٹ کو کان پکڑ کر اٹھا لیا۔

ایک بجلی سی باپو کے ذہن میں کوند گئی۔ اور صورت حال کی سنجیدگی کا اب انھیں اندازہ ہو گیا۔

"کماں خاں رک جاؤ۔!"

یہ کہتے ہوئے باپو راجہ رانا کی طرف متوجہ ہوئے "معاملہ کیا ہے رانا صاحب" یہ پانٹنے بیٹھانا کیا معنی ہے؟"

رانا فخر سے بولے" جانور ہانکا توڑ کر نکل بھاگے تھے تا اسی کا جواب ان سب سے طلب کرنا ہے تحسین صاحب۔ ان بانسوں سے اِن کی پٹائی ہو فی ہے"

" مجھ سے پوچھئے اس کا جواب اِن سے نہیں"

باپو کی اس غیر متوقع مداخلت نے راجہ رانا کو چونکا دیا گویا کہ یہ مداخلت بے جا تھی

کیا آپ کے مہمان کی آٹو میٹک بندوق اس کی ذمے دار نہیں ہے جس کے پے درپے غیر ضروری فائروں سے سانبھر تو کیا بگیروں کا جھنڈ بھی رک نہیں سکتا تھا۔

ان کا اس میں کوئی قصور نہیں رانا صاحب" اور سانبھروں کا ہانکا توڑ دینا کوئی نئی بات نہیں ہے"

راجہ رانا آج نئی بات سن رہے تھے۔ مگر انھوں نے اس کا جواب نہیں

دیا۔ اُدھر کمال خاں اپنی تیاری میں تھا۔ ایک بینت اس کے ہاتھوں میں ناچ رہی تھی کچھ دور میٹ چار آدمیوں کو ڈھکیل کر لا رہا تھا۔ سیاہ ننگے جسموں کے ساتھ چند چیتھڑوں سے اپنی شرم گاہ کو ڈھانکے ہوئے پچھلی شام سے یہ جنگل کے باسی رانا کے اس بانکے تلکھو کے پیاسے سرگرداں تھے۔

باپو کا سر چکرانے لگا تھا" کیا کیا جائے" رانا کے یہاں پہلی دفعہ مہمان ہوئے ہیں۔ کیا کریں کیا یہاں کوئی مداخلت مناسب اور کارگر ہوگی؟ کمال خاں رانا کا معتمد خاص ہے۔ کیا کیا جائے۔ باپو کے ذہن میں ایک ساتھ اتنے خیال سر اٹھائے ہوئے تھے۔

آخر وہ رہ نہ سکے وہ غصّے پر قابو رکھتے ہوئے رانا سے بولے راجہ صاحب میرے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اگر آپ یہ کاروائی روک نہیں سکتے تو مجھے لوٹنے کی اجازت دیجئے۔ میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد جو جی میں آئے کیجئے۔ میں سیدھا اودے پور جاؤں گا۔ آپ میرا سامان بعد میں پہنچا دیجئے۔"

جب یہ جملہ رانا نے سنا تو وہ چونک پڑے۔

یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ تحسین صاحب! یہ تو نہیں ہوگا،،

پھر انھوں نے کمال خاں کو پاس بلایا اور کان میں کچھ کہا۔۔ جس پر اس نے احتجاج کیا مگر رانا کے حکم سے سرتابی ممکن نہ تھی۔

غریب بے قصور بیگار کی سزا سے بری ہو گئے تھے۔ ۔اس وقت ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ لوگ اپنی اس غیر متوقع رہائی پہ مسرت کا اظہار کرنے کے لائق بھی وہ نہ تھے۔ ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے گویا بے یقینی کے ساتھ وہ کبھی رانا کی طرف اور کبھی باپو کی جانب دیکھتے تھے۔ ۔

مگر کمال خاں سے وہ آنکھیں چرا رہے تھے۔ کچھ خوف اور کچھ ناپسندیدگی کی وجہ سے رانا کے واپس راؤے پہنچنے کے بعد کھانا بنا۔ باپو نے راستے میں کچھ جنگلی مرغ شکار کر لئے تھے۔ رات کو راؤے کی چھت پہ پھیلی چاندنی میں کھانا نوش کیا گیا۔

اگلے دن نصف شب کے سناٹے میں گوشت نچنے اور کھائے جانے کی آوازوں نے باپو کو نیند سے چونکا دیا۔ رات کے سناٹے میں یہ آوازیں عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں ساتھ ہی پراسرار بھی۔ ۔آخر باپو نے جھروکے سے نیچے جو جھانکا تو پچھواڑے کچھ ہی فاصلے پر کئی جانور کسی مردہ جانور کو نوچتے کھاتے نظر آرہے تھے۔ یہ کیا جانور ہو سکتا ہے اسے کس نے مارا ہوگا" ؟

باپو بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ گوشت کی بو آرہی تھی چاندنی میں گیدڑ جرکھ اور کتے گوشت نوچ رہے تھے۔ ۔اصل میں وہ کوئی جانور نہیں تھا جسے وہ کھا رہے تھے بلکہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اور ہڈیاں تھیں ۔

ماجرا کیا ہے اس پر غور کرتے ہوئے باپو دوبارہ سو گئے تھے مگر صبح اٹھتے ہی انھوں نے اس کی انکوائری شروع کر دی۔ ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ کام میں لینے کے بعد بچا ہوا سارا گوشت یہاں اسی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ باپو کا سوال تھا۔ مگر اس کا جواب ملازم کے پاس نہیں تھا۔" ان داتا جانیں صاحب"

اگلے دن کوئی شکار کا پروگرام نہیں تھا۔ شام کو رانا کے کھیتوں کی سیر کرنی تھی اور شام کے کھانے کا انتظام بھی کھیتوں میں تھا۔

سفید چٹکی چاندنی میں چٹخارے لے لے کر سب لوگ دال باٹی چورمے کا مزہ لے رہے تھے شکم سیر ہو کر اور کافی دیر رکنے کے بعد وہاں سے واپسی ہوئی اس سے بیشتر وہیں بھیلوں کو بلوا کر اجاڑے کے پہاڑ پر ہانکہ لگانے کی ہدایت دی گئی تھی۔

دوسرے دن پھر شکار پر کوچ ہو گیا ــــ پہاڑ کی تلہٹی میں پہنچ کر اور گھوڑوں سے اتر کر شکار ٹولی پہاڑ پر چڑھ گئی اور ایک جگہ منتخب کر لی گئی۔ ہانکہ آج بڑی تندہی سے لگ رہا تھا۔ گھیرا آخر تک نہیں ٹوٹ سکا تھا۔ دو سانبھر اور ایک چوسنگھا اوپر ہی شکار ہو گئے اور اُجاڑے کی نال میں پہنچ کر دو سوّر بھی مار لئے گئے۔ راجہ صاحب اور ساتھی کافی مستی میں تھے۔ باپو کے نشانے کے وہ بہت قائل ہو چکے تھے۔

راجہ صاحب کو کافی مسرور اور خوش دیکھ کر آخر باپو نے دل کی بات اُن سے کہہ ہی ڈالی۔ جو پچھلی رات نیند ٹوٹ جانے کے بعد رات سے انھیں پریشان کرتی رہی تھی۔ راجہ صاحب سن کر فوراً راضی نہ ہو پائے تھے اور بحث کرنے لگے تھے مگر آخر میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے "اچھا بابا آپ کی جو جی میں آئے وہ کر لینا۔ اپنے ہی ہاتھ سے تقسیم کر دینا"!

یہ آخری جملہ سب نے صاف طور پر سنا تھا مگر کسی کو اِس کی وضاحت کی جرأت نہیں تھی۔ راوٹے پہنچ کر راجہ نے کمال خاں کو ہدایت دی کہ ہانکے والوں کو روکے رکھیں اور شکار صاف ہو جانے پر انھیں مطلع کیا جائے۔

کمال خاں کچھ نہ سمجھ پایا تھا۔ شکار صاف ہو جانے پر رانا کو اس کی اطلاع دیدی گئی تھی۔ رانا نیچے پہنچے باورچی کو بلوایا گیا خود رانا کرسی پر بیٹھ گئے اور باقی کام باپو پر چھوڑ دیا گیا۔

سب لوگ گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ کمال خاں اور باورچی یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ آج رجواڑے کی دیرینہ روایتوں پر بجلی گرنے والی ہے۔ سب قسم کے جانور(۱) کا گوشت ڈھیریوں میں الگ الگ رکھا ہوا تھا۔ کھالوں پر نمک لگایا جا رہا تھا۔ دوسری طرف سینگ ٹرافی کے لئے تیار کئے جا رہے تھے۔

باورچی کو بلا کر باپو بولے "جتنا گوشت بنانے کے لئے چاہیئے الگ نکال لو اور باقی ادھر لے آؤ"!

باورچی خانے کے لئے نکال لینے کے بعد ایک سوّر اور سانبھر کا گوشت بچ رہا تھا۔ ہانکے والوں کا میٹ بلایا گیا ـــــ باپو نے اُسے یہ سب گوشت اپنے ساتھیوں معاونوں میں تقسیم کرنے کے لئے سونپ دیا ـــــ میٹ کو اس بات پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو آج تک کبھی ہوا ہی نہیں ـــــ باپو کی بات کا مطلب ہی گویا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اس غیر متوقع بات پر ہکا بکا ہو رہا تھا۔ اس نے سہمی سی نظر راجہ رانا پر ڈالی تو انھیں مسکراتے پایا۔ باپو کی زبان سے نکلے الفاظ کی تشریح آخر اس مسکراہٹ سے ہو گئی ـــــ اسے یقین آگیا اور اب وہ تیر کی طرح پلٹ گیا ـــــ آخر جب سب کو اس نرالی واردات کا علم ہوا تو ایک ہلچل اور حیرت آمیز سی لہر مجمع میں دوڑ گئی بیگار کرنے والوں کا طبقہ مجبور مسکینوں پر مشتمل تھا جو کہ اسی جنگل میں صدیوں سے زندگی گذار رہے تھے ۔

آخر گوشت کے مساوی حصّے ان میں تقسیم ہو گئے ۔ راجہ رانا کو بھی اپنی اس لادی گئی سخاوت سے یک گونہ اطمینان پہلی ہی بار ہو رہا تھا یا غالباً ہو رہا ہوگا ٹھکانے میں اپنی قسم کے اس پہلے واقعہ نے آدی واسی افراد کی نگاہوں میں یکایک ـــ باپو کو ایک نادر اور مقدس ہستی بنا دیا تھا وہ انھیں بڑی پُر احترام نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔

اس کے بعد سے لگے شکاروں کے دوران ان کی بھاگ دوڑ اور مستعدی میں نمایاں بہتری نظر آئی ـــــ اب یہ لوگ اپنی بے گار کو خوشی کے ساتھ کرتے

نظر آرہے تھے اور باپو کو ٹوپا والا صاحب کہنے لگے تھے ۔ اب وہ ان کی پسندیدہ شخصیت تھے ۔ یہاں تک کہ اب انھوں نے اپنے کچھ گیتوں میں شامل کر لیا تھا۔

ٹوپا والا صاحب آیا ہکار (شکار) چالو رے !

باپو کا یہ شکار کیمپ کم و بیش ایک ماہ تک چلتا رہا ـــــ جنگل کے ان قدیمی باشندوں کو، جنھیں راجہ رانا کی طرف سے ایک چڑیا مارنے کا بھی اختیار نہیں تھا اور جنھیں محض جنگلی پھل پھول جڑوں وغیرہ پر ہی گذارہ کرنا ہوتا تھا۔ اس دوران کئی قسم کا گوشت کھانے کو مل رہا تھا۔ لہٰذا اب وہی لوگ ملنے والے سوّروں کو راؤے کے اتنے قریب گھیر لاتے تھے کہ اوپر سے بیٹھے انھیں گولی کا نشانہ بنایا جاسکے ۔ باپو ان لوگوں کی خاطر ہی صبح سیر پر جلتے ہوئے بھی رائفل ساتھ لے جانے لگے تھے ۔ اور راہ میں اگر کوئی سوّر نظر آجاتا تو اسے شکار کر لیتے ۔ گولی کی آواز سن کر وہ شکار لینے دوڑ آتے تھے ۔ کیونکہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ انھیں کے لئے شکار ہوا ہے ۔ گوشت تقسیم ہونے کی یہ نئی رسم آئندہ بھی جاری رہی ۔ اور اس میں ایک نئی شق یہ لگی کہ کلالوں پر (مے فروش) بھی جو پہلے بیگار سے بری تھے گوشت ملنے کے ساتھ بے گار عائد ہو گئی اور اسی گوشت کی عوض ان پر ان بن باسیوں کو بنا دام شراب پلانے کا بھی حکم نافذ ہو گیا ۔

ہم دریاد، کل دیوتا ناگ

سیاہ ناگ کو اپنا خاندانی دیوتا تصور کئے جانے کی روایت قدیم ہے عرف عام میں ایسا ناگ ہم دریاد، کہلاتا ہے ۔ متعدد حکایات اس سلسلے میں رائج ہیں اعلی اور زمیندار گھرانوں میں تو اسے طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے کہ ان کے دولت کدے میں ناگ دیوتا کا مسکن ہے اس معاملے میں ان کا یقین ہے کہ یہ کوئی دیوتا ہی ہے جو ان کی موروثی جائداد و دولت کی حفاظت کرتا ہے ۔

اپنے طالب علمی کے زمانے میں ہمارے باپو تحسین صاحب ایسے ہی ایک بڑے ہم دریاد سے متصادم ہو گئے تھے ۔ یہ عجیب و ناقابل یقین واردات آج تک ان کے ذہن میں سوالیہ نشان بنائے ہوئے ہے ۔ بات ۱۹۲۶ء کے موسم گرما کی ہے ۔

اس زمانے میں گھوڑا ہی خوش حال خاندانوں کی سواری ہوا کرتا تھا جیسے آج اسکوٹر سائیکل وغیرہ ہے ۔ ہمارے دادا کا جو گھوڑا تھا اُسے سنبھالنے دوڑانے

وغیرہ کے فرائض باپو کے ذمے تھے۔ لہٰذا باپو کا روزانہ معمول تھا کہ اسکول سے آکر ناشتہ کیا اور گھوڑا لے کر نکل گئے اور دس پندرہ میل دوڑا لائے۔

ایسی ہی ایک شام باپو گھوڑا لے کر 'آپڑ' کی جانب نکل گئے۔ آپڑ ندی پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے ان کے دوست غلام مسیح نکل آئے جن کے ہاتھ میں ایک ٹوپی دار بندوق بھی تھی۔ باپو نے گھوڑے سے اتر کر مصافحہ کیا۔ مسیح نے باپو کو اپنے ساتھ روپ ساگر چلنے کو راضی کر لیا اور دونوں ادھر چل پڑے۔ شام اور خنک ہریالی سے محظوظ ہوتے ہوئے دونوں روپ ساگر جا پہنچے۔ مسیح نے باپو کو روک کر تلیا کی پال کے عقب میں بیٹھے تیتروں کی سمت اشارہ کیا۔ باپو گھوڑے سے اترے اور مسیح صاحب اپنی بندوق تیار کرنے لگے۔

دھندلکا فضا پر چھانے لگا تھا مویشیوں کے گھر لوٹتے ریوڑوں سے اٹھا غبار بھی غروب آفتاب کی سرخی کو مٹ میلا کر رہا تھا۔ پاس کے کھیت سے رہٹ کی صدا بھی ماحول میں شامل تھی۔ باپو کو اس وقت پیاس محسوس ہوئی اور انھوں نے اتر کر اپنا گھوڑا درخت سے باندھا۔ ایک بار اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور مسیح صاحب سے بولے "آپ تیتر سنبھالیں۔ میں پانی پی کر ابھی آیا" یہ کہہ کر وہ کھیت کی جانب بڑھ گئے۔ بیچوں بیچ کھڑے باڑے کو لانگھ کر اندر چلے گئے۔ کھیت کے سامنے والا حصہ ہنکا ہوا پڑا تھا۔ بنجر مٹی کے ڈھیلوں سے پٹا ہوا یہ حصہ ہریالی کے نام سے بھی ناآشنا تھا۔ تھوہر کی باڑ سے گھرے اس ۲۰۰ × ۲۰۰ گز چک کے درمیان

ایک کنواں تھا۔

گھوڑے کا چابک گھماتے ہوئے کنویں پر جانے والی پگڈنڈی پر اپنی دھن میں باپو چلے جارہے تھے۔ کنویں پر چلتے ہوئے رہٹ کی مخصوص صدا انھیں نغمہ پارسی معلوم ہورہی تھی۔ پگڈنڈی کے درمیان بائیں جانب جھر بیری کی جھاڑی نظر آتی تھی ہریالی کے نام پر کھیت میں یہی تھی۔ کھیت میں داخل ہوتے ہوئے داہنی جانب سے ایک عجیب آواز "شوں شوں" ہوا کے ساتھ باپو کے کانوں سے ٹکرائی تھی مگر اس نے ان کا دھیان منتقل نہیں کیا تھا۔ وہ برابر آگے بڑھ رہے تھے۔ سرخی مائل سنہری آسمان اور تاریکی سے ہم کنار ہوئی دھرتی اس وقت سورج کو الوداع کہہ رہے تھے۔

باپو کھیت کے بیچوں بیچ جھر بیری کی جھاڑی سے کچھ ہی دور پہنچے تھے کہ دفعتہً ان کا سراپا لرز اٹھا۔ شوں کی وہی آواز اس دفعہ ان کے جسم کو چھو گئی تھی جس نے رہٹ کی لے اور سکوت شام میں ڈوبا ان کا انہماک توڑ دیا تھا۔ ان کی گردن خود بخود داہنی طرف گھوم گئی جدھر سے آواز آئی تھی۔ پگڈنڈی پر جہاں وہ رکے ہوئے تھے وہاں سے بمشکل ۵ فٹ کی دوری پر ایک گراں ڈیل کالا سانپ پھنکار رہا تھا۔ سانپ کے پھن کی بلندی باپو کے نصف قد سے بھی اوپر تک تھی یہ دیکھ کر باپو کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا طاری ہوگیا۔ پل بھر کو وہ وہیں منجمد ہو گئے مگر دوسرے ہی لمحے انھیں محسوس ہوا کہ کسی انجانی طاقت نے انھیں وہاں سے

دھکیل دیا اور وہ بے تحاشا اس مقام سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سرعت سے دوڑ کر جب وہ
کنویں تک پہنچے تو دو قوی بازوؤں سے ٹکرا گئے تھے اور اپنے اس محافظ کے ساتھ زمین پر جا لڑھکے تھے۔

کچھ دیر بعد جب حواس درست ہوئے تو پتہ چلا کہ کسان باہیں پھیلا کر آڑے
نہ آتا تو سانپ سے بچ کر باپو کنویں میں جا گرے ہوتے۔ اس تصور سے ان کی رہی
سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ اور قدموں تلے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی۔
کسان کے چہرے پر ان کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں تاہم بیچ بیچ میں وہ نظر سے اوجھل
ہو رہا تھا۔ گویا نیم بے ہوشی کا عالم تھا۔ اسی دم انھوں نے دیکھا کہ وہ کسان بار بار
نیم سجدہ کی حالت میں جھکا جا رہا تھا ساتھ ہی باپو کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے
کبھی اُن کے کانوں میں انگلی ڈالتا کچھ ڈھونڈتا کبھی ان کے بال سونگھتا اور کبھی
کپڑوں کو۔ وہ کس جستجو میں تھا یہ باپو قطعی نہیں سمجھ پار ہے تھے۔

کچھ وقفے بعد باپو حواس درست کر کے اٹھ بیٹھے گھبراہٹ اب بھی باقی تھی۔
کسان ڈھارس بندھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"گھبرانے کی بات نہیں ۔ ۔ ۔ آپ نہیں جانتے یہ ہمارے کُل دیوتا ہیں"
یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گردن احتراماً جھکائی۔

"ایک جگہ میں بس ایک بار یہ پرکٹ ہوتے ہیں۔ آج ایسا ہی شبھ دن تھا
کہ ان کے درشن ہو گئے۔ کہنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ خوشی سے پھولا نہیں
سما رہا ہے۔ پینی نگاہ سے باپو کو دیکھتا ہوا پھر وہ بولا" اچھا تو باپو اس بات کا

ہے کہ آج دیوتا آپ پر اتنے رُشٹھ کیوں ہوئے ۔ وہ سدا شانتی سے ہی پرکٹ ہوئے ہیں۔ آپنے کوئی سگند بھی نہیں لگا رکھی نہ اور کوئی ایسی بات ہے جس سے انہیں کرودھ آگیا ہو ۔ ایسا بھینکر روپ تو کبھی پہلے دیکھنے میں نہیں آیا" باپو اس کی بات سنتے ہی ماضی قریب کے اسی منظر میں کھو گئے تھے گویا سانپ اب بھی سامنے ہو ۔

"ناگ دیوتا اب جھاڑی میں چلا گیا ہے بابو ، میں برابر دیکھ رہا تھا۔ جب آپ کھیت میں آئے تھے تبھی وہ باڑ کے پرلے سرے سے پرکٹ ہوا تھا اور سیدھا ادھر ہی آیا ۔ آپ اس کے مارگ میں بادھا بن گئے یہ ہی کارن جان پڑتا ہے کرودھ کا ۔ جیسے ہی آپ نے پگڈنڈی پار کی وہ جھاڑی میں چلا گیا، کھیت اتنا کھلا ہے اور ناگ اتنا بڑا کہ وہ بیٹھے بیٹھے بھی دیکھ سکتا ہے۔ آپ اب بے چنتا جا سکتے ہیں،،

مگر باپو تھے کہ اس جھاڑی سے پھر گذرنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہے تھے۔ آخر کچھ دیر پہلے ہی تو عزرائیل سے دوچار ہوئے تھے ۔ کسان اس حالت کو بخوبی سمجھ رہا تھا ۔ اس لئے اُس نے تیتروں کے شکار میں الجھے ہوئے مسیح صاحب کو آواز لگائی ۔ چوں کہ مسیح صاحب تو بھی مشن اسکول کے ٹیچر تھے اور پنڈت جی کہے جاتے تھے ۔ یہی نام لے کر انھیں پکارا گیا تھا ۔

کسان کی پکار سے پنڈت جی چونک پڑے ۔ وہ تو تیتروں کے شکار

میں مصروف تھے انھیں ادھر کا کچھ بھی علم نہ تھا۔۔۔۔آواز سن کر وہ کھیت کی طرف لپ کے۔ باڑے پر پہنچ کر رکے۔ ایک نظر سامنے کوئیں پر ڈالی اور باپو کی یہ غیر متوقع کیفیت دیکھ کر وہ بے چین ہو اُٹھے۔۔ وہ آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ جھربیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسان بولا۔ سانپ۔

پنڈت جی ٹھٹھک گئے۔ پھر ہولے سے باڑہ لانگ کر کھیت میں اتر پڑے۔ جھربیری کی طرف نظر دوڑانے لگے۔ پھر قریب آئے، بندوق کے کندے سے جھاڑی کو ہلانے لگے، کچھ نہ پا کر انھوں نے زور سے جھاڑی کو جھنجھوڑ دیا۔ مگر وہاں اب کچھ نہ تھا۔

'چلے آؤ بھائی۔ کچھ نہیں ہے، وہ باپو سے مخاطب تھے۔ مگر باپو نہیں ہلے۔ گویا ناگ کی پھنکار سے ابھی مبہوت ہی تھے۔ یا گراندیل ناگ کا پھن اب بھی ان کے ذہن میں پھیلا ہوا تھا۔ آخر باپو کو خوف کے نرغے سے نکالنے کی خاطر مسیح صاحب جھاڑی میں ہی اتر گئے اور اسے روندھ ڈالا۔ برجیز اور فوجی بوٹ کے باوجود جھاڑی کے کانٹے انھیں چبھ گئے تھے۔

باپو پھر بھی نہ اٹھے۔۔ مسیح صاحب کنویں پر جا پہنچے اور باپو کو بازو سے اٹھایا "بڑے شکاری بنتے ہو۔۔۔ سانپ سے اس قدر ڈر گئے۔؟

آخر کب تک یہ حالت رہتی باپو اپنی کیفیت سے باہر آ گئے تھے۔ اور مسکرانے لگے تھے۔ بولے:

'پنڈت جی! آپ نے کہاں وہ منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔

خیر چلیے، دونوں وہاں سے کسان کے ساتھ روانہ ہوئے اور جھاڑی کو دیکھتے ہوئے کھیت سے باہر ہوئے۔۔۔ آج تک یہ گتھی سلجھ نہ پائی کہ جھاڑی سے اچانک وہ بڑا سانپ کدھر یک لخت غائب ہوا جب کہ وہاں کوئی سوراخ یا گڑھا نہیں تھا۔۔؟

گل باگھ کا شکار

سال ۱۹۵۴ میں سیدنا محمد برہان الدین صاحب (داؤدی بوہرہ پیشوا) ہاوے پور میں بغرض شکار تشریف لائے۔ آپ کو شیر بگھیرے (Big Game Hunting) کے شکار کا خاص شوق ہے۔ باراں ہاں کے ڈاک بنگلے میں ان کی شکاری ٹولی نے اپنا پڑاؤ ڈال دیا اور مقامی بوہرہ برادری کے معروف اکلوتے شکاری تحسین صاحب یعنی ہمارے باپو کو اس ٹولی کی قیادت سونپ دی گئی۔

جھیلوں تالابوں اور پہاڑیوں پر مشتمل یہ خطہ جنگلات سے زیادہ ہی مالا مال تھا۔ شہر سے ۵۔ ۷ میل کے فاصلے پر ہی ہرن خرگوش تیتر بٹیر مرغابی کا شکار ہو جانا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ شیر تو خیر یہاں کمیاب تھے مگر بگھیرا جسے یہاں گل باگھ بھی کہا جاتا ہے یہ افراط سے پایا جاتا تھا۔ پتلی کمر کے ساتھ نرم اندام چمک دار سنہرے چرم کا مالک بگھیرا شکاریوں کے لئے خاص کشش رکھتا آیا ہے۔

ڈاک بنگلہ ایک بلند ٹیکری پر بنا ہوا تھا اسی کے مقابل جو تلائی تھی اسی

کے بعد سے جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا ایک دو دن تک مچان وغیرہ باندھے جاتے رہے ہم پر تعینات دیہاتی بچوں کے نشانات اور ماما ؤں کی خبریں پہنچاتے رہے۔ کبھی اس درّے اور کبھی اُس درّے شکاری گھومے لیکن انھیں کسی بھی بگھیرے کی صورت نظر نہیں آسکی۔

اس شکاری ٹولی کے اکثر شرکا ء خود شکار کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض شکار سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہی آئے تھے۔ انھیں شکار کے فن اور ساکنانِ جنگل کے عادات وخصائل سے کوئی واقف نہیں تھی اس کے برعکس انھیں اپنے اضطراب و بے قراری پر قطعًا قابو بھی نہیں تھا جب کہ شکار میں خود نظمی درکار ہے۔ لہٰذا کئی دِن خواہ مخواہ ضائع ہو گئے تھے۔ اسی کیفیت میں ایک دل چسپ واقعہ جو پیش آیا اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے :

اطلاع کے مطابق جنگل کے ایک گنجان حِصّے میں پہاڑی پر ایک مردہ بیل پڑا ہوا تھا۔ سُن کر شکاری فوراً دوڑ گئے۔ موقع با پو کے جائزے کے مطابق یہ بگھیرے کا شکار کردہ نہیں تھا کیوں کہ بیل کے جسم پر کہیں کسی قسم کے نشان نہیں تھے۔ دراصل وہ اونچائی سے گِر کر ہلاک ہوا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ان حضرات کو با پو کے خیال پہ یقین نہیں آسکا۔ حالاں کہ باپو نے ان کو باور کرانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ کافی بحث کے بعد انھیں لوگوں کی رائے مسلّم رہی کہ بیل بگھیرے نے شکار کیا ہے۔ وقت گذارنے کے لئے آخر شغل ہی

درکار تھا لہٰذا بیل، کے قریب ہی استادہ ایک مضبوط درخت پر مچان بندھوایا
گیا۔ اسی درخت کے نیچے ایک ۷ - ۸ فٹ کا گہرا کھڈ بھی تھا۔ جناب سیدنا کو
سہارا دے کر آخر مچان پر چڑھا دیا گیا باپو نے سب لوگوں کو مطلع کیا کہ مچان سے
جب بھی وہ ٹارچ روشن کریں گے اس کا مطلب ہو گا کہ وہ مچان سے اترنا
چاہتے ہیں لہٰذا سب لوگوں کو مچان کے گرد آ جانا ہو گا۔ اس کے پیچھے خیال
یہ تھا کہ بگھیرے کی آمد کا فی الوقت امکان نہیں تھا اس لئے خواہ مخواہ دیر تک
مچان پر بیٹھنا دانشمندی نہ تھی۔ اس ہدایت کے بعد دیگر ساتھی چار سو گز دور ایک
ٹیکری پر جا بیٹھے تھے۔

اندازہ جیسا تھا ویسا ہی ہوا بھی۔ بگھیرا دیر تک نہیں آیا۔ آخر باپو نے چٹان
کی سمت ٹارچ ڈالی مگر اس سمت سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ دوبارہ ٹارچ روشن
ہوئی مگر جواً میں خاموشی بدستور طاری رہی جب کہ اس خاموشی کا سبب ہی
سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد باپو نے پوری طاقت سے دو دو بار
آوازیں لگائیں لیکن گھڑی بھر بعد ہی وہ اس اندیشے سے سہم اٹھے کہ اگر
آواز کو کسی لیٹرے گروہ نے سن لیا تو وہ یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔
چوں کہ مچان ڈھلان پر بندھا ہوا تھا لہٰذا پہاڑی کے بالائی حصہ سے ان پر
حملہ بھی ممکن تھا جس کا دفاع ممکن نہ تھا۔ اس عہد میں ڈاکو لیٹرے جنگل
میں گھوما کرتے تھے۔ شکاریوں کی بندوقوں کے ظاہر ہے وہ حاجت مند

ہوا کرتے تھے۔

نصف شب اس طرح گذر گئی جنگل سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے نشتر بھی چلنے لگے کٹیلی جھاڑیوں سے متصادم یہ جھونکے سنائی بھی دے رہے تھے۔۔ باپو نیچے تو اتر سکتے تھے مگر سیدنا کو نیچے اتارنے کا جوکھم وہ گھرے کھڈ کی وجہ سے نہیں لینا چاہتے تھے اس لئے آخر باپو نے ہوائی فائر چھوڑے پہلے کی گڑگڑاہٹ تحلیل ہوتے ہی اگلا فائر ہو نا رہا یہ صدائیں جھاڑیوں سے چھن چھن کر وادیوں میں گونجتی رہیں مگر ان کا بھی کوئی جواب نہیں ملا! اور وقت گذرتا گیا۔ ناچار مچان پر ہی رات گذارنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ سردی سے حفاظت کے لئے محض ایک اوور کوٹ ہی تھا جو دو افراد کے لئے ناکافی تھا آخر صبح ہو گئی۔ جن کا رات سے اس قدر انتظار تھا وہ لوگ بھی مچان تلے آپہنچے تھے ۔۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ لوگ ہرن شکار کرنے کے لئے جنگل کی دوسری سمت نکل گئے تھے ۔۔ انھیں پورا یقین تھا کہ مردہ بیل کھانے کے لئے بگھیرا جلد یا بہ تاخیر ادھر ضرور آئے گا۔ لہٰذا باپو کے مشورے کے برعکس وہ وہاں نہیں رکے۔ پوری بات معلوم ہوئی باپو کو غصہ آگیا مگر انھیں خود پر قابو کرنا پڑا تاکہ سیدنا کا شکار بے مزہ نہ جائے۔

اسی کیمپ کے دوران خبر آئی کہ ۶۰ میل دور ایک گاؤں کے قریب بگھیرا مقیم ہے۔ تصدیق کے لئے باپو نے اپنے بیٹے رضا کو روانہ کیا۔ دو افراد

ساتھ کر دیئے گئے۔ ان لوگوں کو وہاں پہنچ کر بگھیرے سے کوئی جانور کِل (Kill) کروانا تھا۔ بعدازاں وہاں سے اسے کھدیڑنا تھا تاکہ وہ دوبارہ وہاں اپنا شکار نوش کرنے کے لئے بھی آئے تب تک بمعہ سیدنا صاحب باپو موقع پر پہنچ جائیں۔ اس بات کا بھی لحاظ رکھا گیا کہ مچان جس پیڑ پر بندھے اسی کے مقابل 'کِل' کروایا جائے۔ یہ سب کاروائی شکاریوں کے مچان پر مورچہ لینے سے قبل ہو جانی تھی ورنہ بگھیرا مشکوک ہو کر لوٹ سکتا تھا۔

علی الصبح تین اشخاص بڈونا کے جنگل میں پہنچ گئے۔ جنگل قطعی ویران تھا۔ اس خموشی میں بگھیرے کی آمد کا امکان قوی تھا۔ پنجوں کے نشانات بھی جلد ہی مِل گئے۔ جن سے اس کے آنے جانے کا رخ بھی متعیّن کر لیا گیا۔ تجویز کے مطابق ایک محفوظ سے درخت پہ مچان باندھا گیا۔ ایک کھونٹا سامنے گاڑ کر ایک بکرا بھی اس سے باندھ دیا گیا۔ مقابل سمت سے ٹیکری پر چٹانوں کی اوٹ سے، بکرا ہلاک کر دینے کے بعد بگھیرے کو وہاں سے کھدیڑنے کا اہتمام بھی بھائی رضا نے کر لیا۔ مگر دوسرے حضرات اس کاروائی سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ رضا میاں اس وقت محض ۱۳ برس کے تھے۔ دیہاتی کر کے رضا میاں کو لے کر مچان پر جا چڑھے۔ جب تک یہ لوگ مچان پر بیٹھ جائیں دیہاتی یہ احتیاط کرنا نہ بھولے کہ انھوں نے بکرے کے کان اور

آنکھیں بند کر کے گود میں دبا لیا تھا تاکہ بکرا مچان پر انسانوں کی موجودگی سے قطعی لاعلم رہے اور بگھیرے کا سامنا ہونے پر مچان کی جانب نظر ڈال کر بگھیرے کو شک میں مبتلا نہ کر دے۔

یہ کاروائی ہو جانے کے بعد بکرے کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔ خود کو اکیلا پا کر بکرے نے اپنی میں "میں" شروع کر دی جو درجہ بدرجہ تیز اور بلند ہوتی گئی۔ بگھیرے کے کانوں تک یہ آواز جانا لازم تھا۔ سو نے جنگل میں ایسی آواز بلا مبالغہ بگھیرے کو دعوت طعام ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ ماند سے نکل کر بگھیرے نے جنگل کی ٹوہ لینا شروع کیا۔ خطرے کے احتمال سے مطمئن ہو جانے پر وہ آواز کے رخ پر روانہ ہو گیا۔

بمبئی والے مچان پر سانس روکے بیٹھے تھے۔ سکوت طویل ہو گیا تھا بکرا بھی خوف اور تھکان کے مارے خاموش ہو چکا تھا۔ اس وقت صبح کے 9 بجے تھے کہ بگھیرا آخر آ دھمکا تھا یہ بگھیرا نسبتاً قد آور تھا۔ بقول دیہاتیوں کے وہ ایک اونٹ کو بھی شکار کر چکا تھا۔ اس خاموشی سے وہ پہنچا کہ اس کی آمد کا پتہ مچان والوں کو اسوقت چلا جب وہ بکرے سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ بکرا میا کر اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی نگاہ موت کا دیدار کر رہی تھی ادھر بگھیرا مطمئن نظر آ رہا تھا یعنی خطرے کے احساس سے وہ بری تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے جھپٹا مارا اور بکرے کو دبوچ لیا۔ اس کے دانت بکرے کی

گردن میں پیوست ہو گئے ۔ مچان پر بیٹھے ہوئے صاحب پر اس منظر کا عجیب ردعمل ہوا۔ رضا میاں نے بتایا کہ جوش میں آکر وہ کھڑے ہو گئے اور بندوق تاننے لگے ۔ کھڑبھڑ ہوتے ہی بگھیرا چونک پڑا اور جس رخ پر کھڑا تھا اسی سے چھلانگ مار کر جھاڑیوں میں غایب ہو گیا ۔

اب سوال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ مچان سے ایک آدمی کو کیمپ لوٹنے کے لئے اترنا ہو گا اور ایک کو اوپر رہ کر کِل (Kill) کی نگرانی کرنی ہو گی ۔ بگھیرا نزدیک ہی دبکا ہو گا یہ حقیقت تھی ۔ بمبئی والے صاحب اس حالت میں نیچے اترنے کا حوصلہ کر ہی نہیں سکتے تھے چنانچہ نیچے رضا میاں کو خود ہی اترنا پڑا ۔ نیچے آتے ہی بگھیرے کے غرانے کی آواز بھی سنائی دی لیکن رضا میاں نے حوصلہ نہیں چھوڑا اور سنبھل کر آگے بڑھ گئے ۔ ٹیکری پر پہنچ کر ایک آدمی کو ساتھ لیا اور جنگل کے باہر کھڑی گاڑی پر دونوں سوار ہو کر کیمپ روانہ ہوئے ۔

جب یہ اطلاع کیمپ میں سنی گئی تو ایک لہر سی دوڑ گئی سب لوگ آمادہ ہو گئے وہاں پہنچنے کے لئے ۔ لیکن کیمپ لیڈر کا فیصلہ تھا کہ پانچ بجے شام سے قبل مچان پر چڑھنا نامناسب ہے ۔ بڑی مشکل سے یہ بات لوگوں کے گلے اتر پائی تھی ۔ نئے فیصلے کے مطابق ٹولی شام کو مچان پر پہنچی ۔۔۔ بابو اس غلطی پر چین بجبیں تھے کہ مچان پر بیٹھ کر بکرے کا کل (Kill) کر دیا گیا اور مچان والوں کی بے جا حرکت نے بگھیرے کو چونکا بھی دیا ہے ۔ لہٰذا اب اس کی واپسی قطعی غیر یقینی ہو چکی

تھی۔ چنانچہ مچان کو دوسری جگہ منتقل کیا جانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ باپو اس نئے فیصلے سے ٹولی پھر بے مزہ ہونے لگی۔ لیکن سید ناشکار کے ڈسپلن سے واقف تھے اور موجودہ مصلحت کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ ٹولی کے افراد کو خاموش ہونا پڑا۔ مخالف سمت پر مچان باندھ دیا گیا ساتھ ہی شاخیں جھکا کر اسے روپوش بھی کر دیا گیا۔

تاہم مچان کی چھوٹی سی کھٹیا پر پانچ آدمی جا بیٹھے تھے جن میں سید نا کے علاوہ ان کے دو برادرانِ حقیقی تھے۔ باپو کو خاموش ہی رہنا پڑا۔ ٹولی کے دیگر افراد دور چٹان کی اوٹ میں چلے گئے تھے۔ غروب آفتاب سے ذرا قبل ہی بگھیرے کی آمد کا باپو کو اشارہ مل گیا۔ اشارے سے یہ بات برابر والوں کو انھوں نے سمجھا دی تھی۔ اب سبھی نگاہیں جھاڑیوں کی طرف نگراں ہو گئیں تھیں۔ آخر جھاڑیوں سے ایک جسم نمودار ہوا جس پر یہ نگاہیں مرکوز ہو گئیں. یہ منظر دیکھنے والوں کے ذہن و دِل میں ہلچل مچانے لگا تھا۔ گھنٹے بھر سے سب خاموش بیٹھے ہوئے لوگ اب مارے تجسّس کے چاق و چو بند ہو گئے تھے۔ یوں تو سب شکار کی لیڈر کی ہدایت پر عمل پیرا تھے مگر اندر جو کلبلاہٹ ہو رہی تھی اسے وہ دبا بھی نہیں پا رہے تھے۔ کیوں کہ زندہ بگھیرا اس وقت ان کی نظروں کی حدود میں تھا۔

اپنی جبلّی تمکنت کے ساتھ درندہ آگے بڑھنے لگا تھا۔ ذرا کھلے میں آکر

اس نے توقف کیا پھر چوکنا ہوتے ہوئے مردہ بکرے کی جانب بڑھا۔ ۱۵
۱۶ فٹ دور رک گیا۔ گردن گھما کر چاروں سمت کا جائزہ لیا۔ بار بار اس
کی نگاہیں اُسی درخت کی جانب اٹھ رہی تھیں جہاں سے آہٹ پاکر اسے
اپنا تازہ تازہ شکار چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ اب ٹولی کو احساس ہو رہا تھا کہ مچان دوسری
جگہ منتقل کیا جانا کتنا ضروری نکتہ تھا۔ اپنے جائزے سے مطمئن ہو جانے کے بعد
تیندوا پھر کل، کی جانب بڑھا۔ دو قدم چل کر رکا۔ دوبارہ اُس نے اوپر کی
جانب نگاہ ڈالی۔ کچھ لمحوں بعد جب کوئی کھٹکا دل میں باقی نہ رہا تو پھر حرکت
میں آیا۔ مچان پر بیٹھے ہوئے سب لوگ اضطراب و بے چینی میں مبتلا ہو گئے
تھے۔ ان کی یہ حیران نگاہیں بمشکل تمام اس دن جنگل میں اتنے قدآور
تیندوے اور اُس کی نقل و حرکت کا اس طرح نظارہ کرنے میں کامیاب ہو پائیں
تھیں جو کہ خواب و خیال جیسی بات تھی۔۔ اب جیوں ہی تیندوا بکرے کے قریب
پہنچا باپو کا اشارہ پائے بنا ہی سیدنا نے اپنی بندوق چھتیالی اور لبلبی دبانے
لگے کہ بندوق کا کندہ پیچھے سے درخت کی شاخ سے جا ٹکرایا۔ ٹکرانے کی
آواز ہوتے ہی تیندوا چھلانگ بھر کر سب کو ایک دوسرے کا منھ دیکھتے ہوئے
چھوڑ کر پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔۔ سارا کھیل ایک لمحے میں چوپٹ ہو گیا
تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور ایک ناقابل اظہار خفت ٹولی کے
ذہن میں طاری ہو گئی۔ تیندوے کا چند منٹ پہلے دیکھا ہوا ہیولیٰ ان کی

نظروں میں اب بھی گھوم رہا تھا۔

اس خفت ناک واقعہ کے بعد سیدنا کافی دیر شکار اور اس کے قواعد و اصول پر گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ مشہور جنگلوں میں بھی نہ کبھی وہ شکار کرنے میں کامیاب ہوئے اور نہ کبھی اس طرح کوئی جنگلی جانور دیکھنے کو ملا۔

آخر اس شکار کیمپ کی آخری شام آپہنچی۔ اُس پاڈونا کے جنگل میں ہی 'پاٹیا' کے مقام پر پھر بکرا بندھوایا گیا۔ آدمی نگرانی پر بیٹھائے گئے۔

جھٹپٹے کا وقت تھا۔ ایک تیندوا جو شکار کی تلاش میں گھوم رہا تھا وہاں بکرا دیکھ کر اس پر جھپٹ پڑا اور اپنے کنائن دانت اس نے بکرے کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ دیر بعد جیوں ہی اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا آس پاس سے لوگوں نے شور مچا کر اسے وہاں سے کھدیڑ دیا۔

اس کی خبر جب باپو اور سیدنا کو دی گئی تو وہ ایک تیسرے صاحب کو ساتھ لے کر 'پاٹیا' پہنچ گئے۔ مچان بھی تب تک تیار ہو چکا تھا۔ مصلحتاً مچان پر ایک گڈھے کی جانب سے چڑھا گیا تا کہ تیندوا کہیں سے انھیں دیکھ نہ لے۔ موجود لوگ شور اور گفتگو کرتے ہوئے اس مقام سے دور چلے گئے۔ اپنا راستہ صاف دیکھ کر تیندوے کو دوبارہ اُدھر پیش قدمی کرنی ہی تھی۔ اس وقت تاریکی اور خاموشی دونوں ہم کنار تھے۔ کچھ نہیں معلوم ہو پا رہا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد جب ٹارچ نیچے بکرے پر ڈالی تو انھیں بگھیرا شکار کے قریب ہی نظر آگیا۔ اس کے

جسم پر پڑے روشنی کے دائرے میں اس روز دراصل سیدنا کی بندوق کا نشانہ لگنا ہی اس کی تقدیر میں تھا۔ دھماکہ ہوا اور جنگل گونج اٹھا اور پھر سکوت ہوگیا۔ کئی منٹ گذر گئے کوئی آواز نہیں ہوئی۔ روشنی کے دائرے میں بگھیرے کا جسم ساکت نظر آتا تھا۔ تصدیق کے لئے دور چڑھائی پر بیٹھے لوگوں نے پتھر پھینکے مگر بگھیرے میں اب زندگی کا شائبہ بھی باقی نہیں تھا۔ اس لئے وہاں کوئی ردّعمل نہیں تھا۔ چنانچہ سب لوگ دوڑا ور اتر کر شکار کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت ماحول گرم جوشی اور شادمانی سے بھر گیا تھا۔ اتنی جدّوجہد اور انتظار کے بعد کامیاب ہو جانے پر سبھی لوگ مسرور نظر آرہے تھے اور ہنس ہنس کر گفتگو کر رہے تھے۔ آخر صبح ہوئی ڈاک بنگلے پر پہنچ کر بگھیرے کے ساتھ سیدنا ان کے برادران اور باپو کی تصویریں کھینچی گئیں۔ یہ شکار مہم کسی طرح ناکام ہونے سے بچ گئی تھی یہ بڑی اطمینان بخش حقیقت تھی۔

چھلاوا

بے شک ہندوستانی سماج توہم پرستی کے لئے بدنام ہے مگر ایسا نہیں کہ صرف یہی اس کا شکار ہے بلکہ دنیا میں متعدد قومیں ہیں جن میں اپنے انداز سے توہم پرستی رائج ہے یہاں تک کہ جو کل تک اس سے بری تھے آج مادّی ترقی کے عروج پر ہوتے ہوئے بھی وہ معاشرے توہم پرستی اور کج اعتقادی میں مبتلا ہیں ۔

جس طرح کائنات بذات خود ایک ناقابل فہم معمہ ہے اسی طرح کائنات میں لاتعداد مضمرات ہیں ۔ انھیں کو باور نہ کر پانے کی ذہنیت کج یقینی کا سبب ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سچ تو یہ ہے کہ توہم پرستی انسانی زندگی کے لئے ایک مہلک صورت حال کے مترادف ہے ۔

اوروں کی طرح شکاری بھی توہم پرست ہوتا ہے جب کہ منطقی طور پر اسے بہادر ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ لفظ شکاری تاثر دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے والد کا کہنا ہے کہ شکاریوں میں عجب عجب وہم رائج ہیں ـــــــ مثلاً ۔ ۔ کچھ لوگ

تین کارتوس سے زیادہ اپنے ساتھ نہیں لے جاتے خواہ شکار شیر کا کھیلنا مقصود ہو۔ کسی کا یقین ہے کہ ہفتے کے کسی خاص دن کسی خاص جانور کا شکار مناسب نہیں۔۔۔ کچھ شکاری تعویز گنڈے ساتھ رکھتے ہیں۔ کچھ راہ میں جالا تنتی ہوئی لکڑی نظر آجانا خوش آئند تصور کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ یہ قابل ذکر ہے کہ ہمارے والد یا دادا اپنی شکاری زندگی میں کسی ایسے وہم کا شکار نہیں رہے۔ بھوت پریت کا وجود بھی انھوں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ رات کی تیرگی میں سائیں سائیں کرتے ویران جنگلوں میں شب بیداریاں کرتے اور ناقابل فہم واقعات کے شاہد ہونے کے باوجود وہ کبھی توہم پرست نہیں بنے — ہاں والد کے اس دعوے کے باوجود کہ انھوں نے خود کو وہم پرستی سے بچائے رکھا ہے وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتے کہ اپنی شکاری مہمات کے دوران وہ ایسے پُراسرار حالات سے بھی دوچار ہوئے ہیں جن کی کوئی منطقی توضیح وہ اب بھی نہیں کرسکتے۔

اگلی سطور میں ایک ایسا ہی واقعہ نذر قارئین ہے:

یہ سن ۳۵ یا ۳۶ کا ذکر ہے۔ اراؤلی کی حسین گھاٹی میں بسی میواڑ کی راجدھانی اودے پوران دنوں کافی دیدہ زیب لگتی تھی۔ قصبے کی ہر چہار جانب شہر پناہ جابجا بلند دروازں کے ساتھ کھڑی تھی۔۔۔ یہ دروازے چاند پول ہاتھی پول سورج پول وغیرہ ناموں سے موسوم تھے۔ یہ دروازے

اب بھی موجود ہیں اگرچہ شہر پناہ شہر کی توسیع کی خاطر مسمار کر دی گئی ہے۔ ان دنوں شہر پناہ کے میل دو میل بعد ہی جنگل کی ابتدا ہو جاتی تھی۔

تب انگریزی حکومت کے تحت اودے پور میں ریزیڈنٹ کا دفتر ہوتا جس میں تعینات میر منشی یا ہیڈ کلرک بھی بڑا عہدے دار سمجھا جاتا تھا۔ میواڑ دربار سے اسے وہاں کے رزرو جنگلات میں بگھی پر سوار گھومنے سیر کرنے کی سہولت بھی حاصل تھی۔ ہر اتوار کو ہیڈ کلرک کے لئے کوچوان بگھی لے کر اس کی رہائش گاہ پر آیا کرتا تھا وہی کوچوان اس سیر کی رپورٹ بھی ریزیڈینسی میں دیا کرتا تھا۔

مولوی عبدالعزیز ان دنوں وہاں ہیڈ کلرک ہوا کرتے تھے جو کہ باپو کے قریبی دوستوں میں بھی تھے لہٰذا باپو بھی اکثر اس سیر میں شریک رہا کرتے تھے باپو کو ریاست سے انھیں جنگلات میں شکار کی خاص اجازت بھی حاصل کر لی تھی

ایک شام حسب دستور مولوی صاحب کی بگھی باپو کو لینے آئی اور باپو بندوق کے ساتھ شکاری لباس میں سوار ہو گئے۔ اب بگھی نتسری کے جنگل سے گذر رہی تھی۔ اسی دوران ایک غیر معمولی احساس باپو کے اندر سر اٹھانے لگا تھا جس کی وجہ ظاہر نہیں تھی۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا اس کی وجہ کوچوان تھا جو کہ مستقل طور پر چپ لگائے ہوئے تھا۔ چہرے پر جب نظر گئی تو ماتھا ٹھنکا کوچوان قطعی نیا شخص تھا۔ سائیس کا چہرہ دیکھا تو وہ بھی اجنبی تھا یہ دونوں ہی اس سے قبل کبھی بگھی لے کر نہیں آئے تھے۔ نہ ہی کبھی انھیں

دربار کے عملے میں پہلے دیکھا گیا۔ نہ معلوم باپو یا مولوی صاحب کیوں اِن لوگوں سے کوئی استفسار بھی نہ کر پائے بس دونوں پرانے کوچوان کی غیر موجودگی محسوس کرتے رہے جو خوش مزاج تھا اور برابر باتیں کرتا رہتا تھا اس طرح چپ وہ کبھی نہ رہا تھا۔ خیر بگھی رواں تھی جنگل کی مخصوص خوشبو کے ساتھ ہوا اٹھکیلیاں کر رہی تھی پرندوں کی چہچہاہٹ بھی کانوں میں پڑ رہی تھی جس سے نحوست کا احساس کم ہونے لگا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ اس دن کی سیر نحوست سے شروع ہو کر نحوست پر ہی ختم ہونی تھی جب کہ ایک سنسنی خیز واقعہ ان لوگوں کی آمد کا ہی منتظر تھا۔

بگھی ایک مقام پر روک دی گئی اس تنگ راستے کے دونوں جانب گھنے درخت تھے جھر بیری کی جھاڑیاں بھی جا بجا تھیں جن سے پکے بیروں کی خوشبو آ رہی تھی تیتروں کی آوازیں ہر سمت سے دعوت دے رہی تھیں۔ باپو بندوق لے کر آگے بڑھے۔ بیٹھے ہوئے تیتروں پر گولی چلانے کی بجائے انھوں نے پہلے پتھر پھینک پھینک کر انھیں اڑایا۔ اڑتے ہوئے پرندے دھائیں دھائیں فایروں کے ساتھ زمین پر گرنے لگے جنگلی ماحول میں فایروں نے ہل چل پیدا کر دی تھی۔ آدھ گھنٹے تک یہ سلسلہ چلتا رہا اس کے بعد شکار بٹور کر بندوق انلوڈ کر دی گئی۔

'چلو اور چلیں' باپو مولوی صاحب سے مخاطب ہوئے۔ مولوی صاحب چہل قدمی کرتے ہوئے بگھی پر آ بیٹھے۔

مگر کوچوان نے بجائے بگھی کو واپس کرنے کے آگے بڑھا دیا تھا مولوی صاحب غالباً یہ سوچ کر خاموش رہے کہ سکرے راستے پر مڑ نہ سکنے کے سبب دوسرے راستے سے لے جارہا ہے ـــــ غروب آفتاب کا وقت ہو چکا تھا شفق کی خونین سرخی مغربی افق پر چھا گئی تھی ہوا ٹھنڈی ہو گئی تھی گھوڑوں کی ٹاپیں ہوا کی دھیمی لے پر تال دے رہی تھیں۔ کوچوان اور سائس برابر خاموش تھے یہاں تک کہ ان کی خاموشی مشکوک لگنے لگی تھی ۔ دفعتاً راستے کے موڑ پر کوچوان نے گھوڑوں کی لگام کھینچ لی ۔ بگھی سے ۲۰ ۔ ۲۵ فٹ دور ہی چنکاروں کا ایک بڑا جھنڈ کھڑا دکھائی پڑ رہا تھا جسے دیکھ کر مولوی صاحب باپو کو اشارہ کرنے پر مجبور ہو گئے باپوان کا ایما سمجھ کر بندوق لے کر اتر پڑے ۔ بندوق میں کارتوس لگا کر ایک نر چکارے کو جس کے خوب صورت سینگ تھے نشانہ بنا دیا۔ گولی لگتے ہی وہ اسی مقام پر ڈھیر ہو گیا سبھی لوگوں نے اسے زمین پر گرتے ہوئے دیکھا گولی چلانے کے فوراً بعد باپو اور مولوی صاحب کا اردلی چکارے کی طرف دوڑے جب وہاں پہنچے تو دیکھ کر حیرت میں آ گئے کہ چکارے کا وہاں کہیں پتہ نہ تھا دونوں سناٹے میں آ گئے اور ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے ۔ ان کی حیرت یہ جان کر دو بڑھی کہ پورا جھنڈ ہی چشم زدن میں روپوش ہو چکا تھا ۔ تو کیا گولی چلنا دہم تھا یا چکاروں کا نظر آنا ۔ لیکن پانچ جوڑ ... آنکھیں تو ایسا فریب نہیں کھا سکتیں ۔ !

ایسا لگتا تھا کہ جنگل کا سناٹا طنزیہ مسکراہٹ سے ان کی تضحیک کر رہا ہے۔۔۔ دفعتاً قریب سے ہی کوئی زنانی آواز ابھری جو مقامی بولی میں بچی کو پکار رہی تھی۔ اے چھوری اتھے آوے نئے۔

آواز سن کر یہ لوگ کانپ اٹھے۔ اس وقت سنسان جنگل میں یہ کون عورت ہے؟ پل بھر بعد دوبارہ وہی الفاظ سنائی دے اور تیسری بار بھی۔۔ اے چھوری۔۔ نگاہیں چاروں سمت گھومیں ایک ایک جھاڑی ٹٹولنے لگیں مگر وہاں کہیں کوئی انسانی وجود نظر نہ آیا نہ کوئی رنگین چونر چمکی نہ کنگن کھنکا۔ وہاں کوئی عورت تھی ہی نہیں۔ ابھی سب اسی الجھن میں تھے کہ اسی مقام سے ایک زخمی مردانی پکار ابھری۔۔ "ارے یا گولی تو مہارے لاگی رے۔۔" یہ کراہ دو تین بار سنائی دی اور پھر آخری بار ہچکی سمیت وہ ڈوبتی سی سنائی دی جیسے مجروح موت کی گود میں جا رہا ہے۔

اس خاموشی سے ابھری ان پراسرار آوازوں کو بگھی پر بیٹھے لوگوں نے بھی صاف سنا کیوں کہ وہ بگھی سے آگے تک سنی جا سکتی تھیں۔

محض آواز ہی آواز تھی مگر کسی کا وجود نظر نہ آتا تھا۔ یعنی اسرار فقط اسرار۔ بڑی ہی ناقابل فہم صورت حال تھی۔

فایر، خون۔۔ مگر کس کا؟ کہاں ہے مقتول۔ کہاں ہے وہ آواز لگاتی ہوئی عورت اور اس کی بچی۔۔۔؟ کسی کی بھی کوئی آہٹ کیوں نہیں

سر چکرانے لگا باپو کا۔۔ دل نے کہا کوئی بلا ہے۔ مگر عقل نے نہ مانا۔ ان کے پاؤں آواز کی سمت بڑھنے لگے تھے۔ تبھی مولوی صاحب نے انھیں ٹوکا۔ باپو پھر بھی مصر ہوئے۔ " مجھے دیکھ تو لینے دیں کہ آخر ماجرا کیا ہے''

مگر مولوی صاحب نے بگھی مڑواکر باپو کو سوار ہونے پر مجبور کر دیا۔

واپس ہوتے ہوئے نہ کسی نے انھیں للکارا نہ تعاقب کیا۔ عورت کا رونا بھی نہیں سنا نہ مرد کے مجروح ہونے کا کوئی ردعمل۔۔ کہیں کچھ بھی پیش نہیں آیا۔ کوچوان اور سائیس بدستور خاموش تھے ان کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہ تھے گھوڑوں کی ٹاپیں سر پر ہتھوڑے چلاتی رہیں سب خاموش تھے۔ اردلی سہما ہوا تھا مولوی صاحب تسبیح کرنے لگے تھے۔۔ باپو مولوی صاحب کے بنگلے سے پیدل ہی گھر لوٹ آئے تھے۔

باپو کو چین نہیں تھا ان کی روح بے چین تھی انھیں اپنے ہاتھ کسی کے خون میں رنگے نظر آنے لگے۔۔ اس عورت اور بچی کا کیا ہوا ہوگا؟ کون تھے وہ لوگ اس واقعہ کا کوئی ردّعمل کیوں نہ ہوا۔۔ یہ سوالات رات بھر ذہن میں ہلچل مچاتے رہے ــــ صبح اٹھ کر حلقے کے سب انسپکٹر اشور سنگھ کے پاس اپنے جرم کی اطلاع دینے باپو آخر جا پہنچے۔

مزاج پرسی کر کے سب انسپکٹر نے جو باپو کے شناسا تھے انھیں کمرے میں بیٹھایا اور واقعہ شروع سے آخر تک سن کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ کھڑکی کے

قریب رکے۔ آسمان کو دیکھنے لگے اور پھر واپس کرسی پر آبیٹھے ۔ بولے

"کیس درج کرنے سے پہلے آپ مجھے کچھ وقت دیں کہ میں اس کی پوری

تفتیش کر لوں۔ کل میں اپنے حلقے کی خبر گیری کے لئے جاؤں گا ۔

آپ میرے ساتھ چلیں ۔"

اگلی صبح دونوں تتری کے جنگل میں تھے ۔ اسی مقام پر انسپکٹر نے کھوج بین

کی کوئی خون کا دھبہ کوئی لاش وہاں کہیں نہیں تھی ۔ اس کے بعد انسپکٹر

نے حسب سابق مقامی لوگوں سے ان کی خیریت پوچھی ۔ کسی واقعہ حادثے یا

قتل کے یا کسی کے گم ہو جانے کی بات سننے کو نہیں مل سکی ۔ سب طرف

خیریت ہی خیریت پائی گئی اس کھوج بین سے شام کو واپسی ہو پائی ۔ ابھی

یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ دربار میں کوئی شکایت ہوئی ہو ۔ لہٰذا گھر پر طلبی

کا فرمان آپہنچا ہوگا مگر گھر آکر یہ بھی نہیں سننے کو ملا اور خوف بے بنیاد نکلا ۔

غرضکہ نہ کوچوان نے اس واقعہ کی رپورٹ ریزیڈینسی یا دربار میں کی نہ علاقے

سے ایسی فریاد پہنچی نہ جنگل میں اس کا سراغ ملا بلکہ یہ حقیقت بھی نہ کھل سکی کہ آیا وہ بگھی ریزیڈینسی

سے ہی آئی تھی یا کہیں اور سے اور اس کے کوچوان اور سائیس کہاں سے تعلق رکھتے تھے۔

وہ آوازیں ۔ عورت اور زخمی مرد کی ۔ کیا تھا؟ باپو جب بھی اس واقعہ کی جزئیات پر غور کرتے

تو آخر مولوی صاحب کے جائے واقعہ سے لوٹ چلنے کے اصرار میں کہے گئے الفاظ کانوں میں گونج اٹھتے

"چھلاوا ہے چھلاوا اور کچھ نہیں ۔ ضد نہ کرو چلے چلو یہاں سے ! ۔ ۔ "

شکار در شکار

۱۹۴۸ء میں ہمارے باپو کے پاس ریاستی زمانے سے جو اسلحہ فروشی کا مونوپولی لائسنس تھا وہ نئی راجستھان سرکار نے واپس لے لیا۔ جو سامان دوکان میں تھا وہ بھی پولیس نے جمع کروالیا۔ اس طرح ایک جماجمایا کاروبار ختم ہوگیا اور باپو کے سامنے اپنی گرہستی چلانے کے لئے کوئی نیا ذریعہ معاش اختیار کر لینا لازم ہوگیا۔ اس معاملے میں جب انھوں نے غور کیا تو شکاری کی نظر آخر جنگل پر ہی جاکر ٹھہری۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ ہتھیاروں کا خاصہ ستھرا کاروبار کرنے والا یہ شخص کان کنی کا مشکل دھندا کیوں کرنے جا رہا ہے۔ ۔اودے پور ڈویژن میں یہ کام کرنے والے باپو پہلے شخص تھے۔

اس حوصلہ آزما کاروبار کے لئے باپو نے برواڑہ کا علاقہ منتخب کیا جہاں کہ ابرک اور بیرل ہو رن نکلتا تھا۔ یہ علاقہ بناس ندی کے کنارے کمبھل گڈھ کے راستے میں ہے جس کے قریب اراولی پہاڑی سلسلے کا جرگہ پربت سر اٹھائے ہوئے ہے اور اس کے چاروں جانب ہے گھنا جنگل جس میں انسانی گذر

نہیں کے برابر رہا تھا۔ یہ صرف اپنے بن باسیوں کا یا اس کے غار گھاٹیاں ڈاکو لٹیروں
کے مسکن ہی تھے۔ اسی جنگل سے گذر کر باپو کو اپنی کانوں تک جانا آنا پڑتا تھا۔ اس
سفر میں ان کی خاص ساتھی فولڈنگ چھت والی فورڈ گاڑی تھی۔ اس بے راستہ
جنگل میں دھیرے چل پا۔ بھی وہ اپنی سواریوں کو منزل تک پہنچاتی رہتی تھی۔ اس
دشوار گذار پیہڑ میں کامیابی سے گذر جانا ہر گاڑی کے بس کی بات بھی نہیں تھی

اُن دنوں وہاں لٹیروں کے ایک گروہ نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اس
سے فائدہ اٹھا کر مقامی قبائلی اُدھر سے گذرنے والے راہگیروں کو تنگ کیا کرتے تھے۔
باپو وہاں کبھی مچھلی پکڑنے کے لئے دیر تک رک جاتے مگر لٹیروں سے کبھی
سابقہ نہیں پڑا نہ کبھی انھوں نے ایسی ہمت کی۔ ایک دن باپو کو معلوم ہو گیا تھا کہ
ایک کان کن اِن لٹیروں سے ملا ہوا ہے بشکل تمام باپو نے اسے اپنے اعتماد میں
لے کر گروہ سے کہلوا دیا کہ اگر انھوں نے اس علاقے میں لوٹ مار نہیں چھوڑی تو
گولیوں سے بھون دیئے جائیں گے یہ بھی کہ باپو کے پاس دوربین بھی ہے جس سے
وہ اُن لوگوں کی نقل و حرکت دور سے ہی معلوم کر لیتے ہیں۔ وہ پہاڑوں میں
تمہارے خفیہ ٹھکانوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ یہ دھمکی کارگر رہی اور علاقے سے
لٹیروں کا خوف ختم ہو گیا۔

اِس مسئلے سے گلو خلاصی ہوئی ہی تھی کہ ایک نئی پریشانی آ پہنچی وہ یہ کہ ایک
بگھیرے نے آکر دہشت پھیلا دی جو مویشیوں کے باڑوں میں داخل ہو کر آئے

دِن دیہاتیوں کے مویشی ہلاک کرنے لگا۔ تنگ آکر لوگوں نے مویشی، باڑوں سے اپنے جھونپڑوں میں منتقل کر لیے تاہم بگھیر اکھپریل کے اوپر سے کود کر اپنی کارروائی کرنے لگا اور پہلے سے زیادہ خطرناک بن گیا۔ لوگ ہراساں ہو کر آخر باپو کے پاس مدد مانگنے آئے۔ شکاری ہونے کی حیثیت سے انھوں نے یہ استدعا قبول کرلی جب کہ وہ اپنی کان کنی کے ابتدائی سروے میں کافی مصروف تھے۔

بناس ندی کے اس ساحلی جنگل میں ندی کے بلند کگار پہ ایک عجیب غار تھا جس کے متعلق کئی باتیں کہی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ غار میلوں طویل ہے آگے میدان ہے جہاں سادھو سنت دھونی رماتے ہیں۔ باغیچہ اور کنڈ بھی ہے۔ یہ بھی سُنا جاتا تھا کہ ایک گڈریا اپنی بکری ڈھونڈتا ہوا اس میں دور تک داخل ہو گیا تھا اُسی نے سب کچھ دیکھا تھا۔ جسے سادھوؤں نے پکڑ بھی لیا تھا اور اس شرط پر رہا کیا کہ کسی سے کچھ کہے گا نہ دوبارہ اِدھر آئے گا نہ کسی کو آنے دے گا۔ بگھیرے کے متعلق بھی مختلف باتیں سننے کے بعد باپو کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ خونی بگھیرا اسی میں نہ پناہ لیے ہو ــــــ لہٰذا انھوں نے غار کی کھوج لگانے کا ارادہ کرلیا۔

اس دن واپسی میں باپو کے ساتھ دو کنسلٹنگ انجینیر بمع اپنے ایک ساتھی محمد حسین بھی تھے۔ اس کمہار کو بھی ساتھ لے لیا جو غار کو جانتا تھا۔ فورڈ گاڑی خشک ندی میں ہوتی ہوئی کنارے پر رُکی۔ سب لوگ اتر کر، غار کے دہانے پر پہنچے۔ چار فٹ چوڑے دہانے کو سب نے دیکھا مگر سوائے محمد حسین کے باپو کے ساتھ

اندر جانے کو اور کوئی تیار نہ ہوا۔ داخلے سے قبل باپو نے کسی بھی جانور کی آمد و رفت کے لئے نشانات ڈھونڈے مگر وہاں بگھیرے کے پنجوں کے نشان نہیں تھے۔ اژدھے کی گھسرن جیسے نشان ضرور نظر آئے جس کے وہاں ہونے کا بھی امکان تھا۔ ہاں جانوروں کے داخلہ کا راستہ غار کی دوسری جانب بھی متوقع تھا۔ سامنے سے بھی جانور آسکتا تھا لہٰذا ہوشیاری ضروری تھی۔ طے ہوا باپو رائفل لئے آگے رہیں گے پیچھے محمد حسین ٹارچ دکھائیں گے نیز غار کے داہنے اس طرح سٹے ہوتے بڑھیں گے کہ اگر سامنے سے کوئی جانور آنکلے تو اُسے ٹکر لئے بغیر راہ مل جائے۔ دس فٹ آگے بڑھنے پر روشنی ایک پُرانے الاؤ کی راکھ پر پڑی آس پاس کوئی خاص بات نظر نہ آئی کیڑے مکوڑوں کے رینگنے کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ بہر حال یہ دونوں قریب سو فٹ تک اندر چلے گئے۔ تبھی چٹان پر جاکر روشنی ٹھہری ایسا لگا کہ یہاں غار بند ہوگیا ہے لیکن دیکھنے پر وہاں سے راستہ موڑ کھا گیا تھا۔۔۔ سوچا کہ منزل آگئی ابھی کے آگے میدان اور سادھو سنت ہوں گے اور ان کی دھونی وغیرہ یہ سوچتے ہوئے دونوں موڑ کی طرف بڑھے مگر دراصل وہ موڑ نہیں غار کا اندر دبا ہوا کھانچا سا تھا یہیں غار کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ روشنی سے بخوبی جائزہ لے کر دونوں ساتھی آخر بخیریت باہر آگئے تھے۔

غار میں بگھیرا ہونے کا امکان ختم ہو گیا تھا مگر اُس کا کوئی دوسرا سراغ بھی

نہیں ملا تھا۔ آخر باپو جستجو کرتے ہوئے گاؤں سے کچھ دور والے نالے پر گئے اس میں اترنے پر معلوم ہوا کہ چڑھائی پر جانور کے پنجوں کے نشانات ہیں۔ یہ بگھیرے ہی کے تھے آگے بڑھنے پر یہ نشانات غائب ہو گئے تھے۔ اس مقام سے کچھ آگے درختوں کے درمیان ایک چوک سا تھا۔ ان درختوں پر کئی رات کئی سمتوں پر مچان باندھے گئے بکرے باندھے گئے مگر وہ چالاک جانور وہاں نہیں پھٹکا مجبور ہو کر ایک غیر معمولی ترکیب کرنی پڑی وہ یہ کہ گاؤں کے سرے پر واقع ایک گھر خالی کروا کر وہاں بگھیرے کی تاک میں بیٹھا جائے گا۔ سن کر دیہاتی حیران ہوئے کچھ نے خطرہ اٹھانے سے منع بھی کیا مگر باپو کا عزم مصمم تھا۔

سرما کی رات میں جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا کوٹھری میں جلتے لالٹین کی دھیمی روشنی بانسوں کے دروازے سے چھن کر جھاڑیوں پر پڑ رہی تھی۔ دروازے کی زنجیر اس طرح لگائی گئی تھی کہ بند دروازہ کھلا ہوا معلوم ہو دروازے کے مقابل ہی چارپائی پر باپو نے دو راتیں کمبل اوڑھے گذار دیں مگر کچھ بھی پیش نہیں آیا۔

آخر، تیسری شب پھر کٹیا میں بیٹھ کر باپو حسب سابق بگھیرے کی راہ دیکھنے لگے۔ اُس رات کچھ بکرے بھی ایک جانب باندھے گئے تھے۔ سردی نسبتاً کم تھی ہوا بھی ہلکی تھی آسمان پر صرف ستارے تھے چاند نہیں۔ خاموشی سے باپو چارپائی پر بیٹھے تھے۔ اب رات ڈھلنے کا وقت ہو چکا تھا دو شب بیداریوں سے باپو کی آنکھیں خواب آلودہ تھیں کہ دفعتہً دور کہیں سو کھے پتے چرمرا گئے اسی آہٹ

نے باپو کی نیند کافور کر دی۔ وہ چوکنے ہو گئے۔ بکرے بھی اس آہٹ سے ممیا اٹھے
آہٹ قریب آتی لگ رہی تھی پھر لمحے بھر سناٹا ہو گیا۔ اچانک کمبل ڈھکی باپو
کی پیٹھ پر ناخون چبھنے کا احساس ہوا مگر دراصل یہ ناخون پیٹھ پر نہیں بلکہ یہ پیٹھ سے
لگی دیوار پر ناخونوں کی کھرچن تھی جو اندر تک چھو گئی۔ اس کے بعد بائیں دیوار پر
یہی کھرچن ہوئی۔ یہ طے تھا کہ باہر کوئی جانور موجود ہے۔ بندوق کندھے سے
لگ گئی اور انگلیاں لبلبی پر۔ سیاہ رات میں لالٹین کی مدھم روشنی جو دروازے
کو پار کر رہی تھی وہ کپکپا گئی اسی کے ساتھ بندوق پر لگی ٹارچ کا بٹن دبا۔ روشنی
میں دروازے کی دراز سے اندر آنے کو کوشاں جانور کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ فوراً
انگلیوں نے بندوق داغ دی۔ ٹھائیں کے ساتھ باپو کو پیچھے کی سمت دھکا لگا
اور لالٹین بجھ گئی۔ جھٹکے کی وجہ سے یہ نہیں طے ہو پایا کہ گولی کا انجام کیا ہوا۔؟
پل بھر کے اس واقعہ کے بعد واپس سکوت طاری ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی سے
دروازے کے باہر انچ انچ جائزہ لیا مگر کوئی بات گرفت میں نہیں آئی۔ نہ
کوئی حرکت نہ کوئی آہٹ نہ غراہٹ۔ باپو اپنی جگہ سے اٹھے لالٹین روشن کی
اور سوچ میں پڑ گئے۔ باہر نکل آنا اس وقت مناسب نہیں تھا لہٰذا صبح ہونے
تک اسی طرح بیٹھے رہے۔

پو پھٹ رہی تھی چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ کوّوں کی کائیں کائیں
بھی ہونے لگی تھی دور سے جنگلی مرغوں کی بانگ بھی سنائی دیتی تھی۔ جنگل

جاگ اٹھا تھا اور رات کا سناٹا ختم ہو گیا تھا۔ بے فکر ہو کر باپو نے دروازہ کھول دیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک گرانڈیل بگھیرا زمین پر ابدی نیند سو رہا ہے۔

ٹھنڈی ہوا اس کے بوٹے دار رونگٹے کو لہرا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر باپو نے نال اونچی کر کے ہوائی فائر کیا۔ آناً فاناً میں گاؤں وہاں جمع ہو گیا۔ خوشی کا جشن ہونے لگا۔

کچھ دیر آرام کے بعد چرم اتارنے اور نگرانی کے لئے ضروری ہدایات دے کر باپو اپنی کان پر لوٹ گئے دن وہاں گذارنے کے بعد شام کو بناس پر مگرمچھ کے شکار کا ارادہ بن رہا تھا مگر مچھ وہاں کثرت سے تھے جو پانی پر آئے مویشیوں کو دبوچا کرتے تھے۔ ایک ایک کھڈ میں ۲۰۔۲۵ مگر کا ٹھکانا ہونا عام بات تھی۔ مگر یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ شاید اس لئے کہ ایک دوسری مٹھ بھیڑ ان کی پہلے سے منتظر تھی۔ جب وہ گاؤں واپس پہنچے تو بگھیرے کے گرد بیٹھے لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور دنیا جہان کی باتوں میں شام ڈھل گئی تھی۔ اب وہ دوسرے پروگرام ملتوی کر کے گھر اودے پور لوٹنا چاہتے تھے۔

راہ میں گھسار کا گھاٹ پڑتا ہے جیسے ہی وہاں گاڑی پہنچ کر اترنے لگی کہ پہاڑ کی ڈھلان سے دو آنکھیں چمکنے لگیں جو کہ ٹارچ کی روشنی ڈالنے پر ساکت ہو گئیں۔ گاڑی کی چھت کھلی تھی پانچ بڑی سواریاں اور بچے اس میں سوار تھے جانور بلندی پر اور گاڑی کے آگے ڈھلان تھا۔ آنکھوں کا فاصلہ تقریباً ۲۰ فٹ تھا۔ ہانکا لگائے بغیر شکار باپو پسند نہیں کرتے تھے۔ گاڑی رکی ہوئی تھی۔ باپو اسی طرح بگھیرے سے

مقابل رہنے کی کچھ دیر سنسناہٹ محسوس کرنا چاہتے تھے ۔ ٹارچ ڈال کر وہ اسے کھلا رہے تھے مگر ہم رکاب افراد اور بچوں نے ان سے گولی چلانے کا اصرار کیا ۔ گولی چلی بندوق کی آواز گونجی مگر گولی کی گڑگڑاہٹ کا ساتھ کسی غراہٹ نے نہیں دیا ۔ اس کا مطلب تھا کہ یا تو گولی اتنی صحیح لگی کہ جانور کی آواز بھی نہ نکل سکی یا وہ صاف بچ کر بھاگ نکلا ـــــ اس میں یہ بھی امکان تھا کہ وہ زخمی ہو کر بھاگا ہے اگر ایسا ہوا تو غضب ہوا ۔

گھاٹی کے اس موڑ کے مقابل ایک کھلا مقام تھا جس پر واقع مندر کے قریب ایک بڑا درخت کھڑا تھا جیسے ہی گاڑی وہاں رکی روشنی میں دو ہتھیار بند اشخاص نظر آئے ۔ تیسرا اونٹ پر سوار تھا ۔ باپو ان کے قریب گئے اور بولے "بگھیرا زخمی ہو گیا ہے اس لئے آپ لوگ آگے نہ بڑھیں ۔ میں ذرا دیکھ کر لوٹتا ہوں "۔ اتنا کہہ کر وہ گاڑی کو دوبارہ پہاڑی پر لے گئے اور ٹارچ کی روشنی سے جھاڑی جھاڑی چھاننے لگے مگر جانور کہیں نظر نہیں آیا ۔ لوٹ کر انھوں نے دوبارہ ان اشخاص کو احتیاط سے آگے بڑھنے کی ہدایت کی جب وہ جانے لگے تو باپو انھیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے ۔

گھر پہنچنے تک رات کافی ہو گئی تھی صبح ہوتے ہی باپو رات والے شکار کی تلاش میں واپس گھسار گھاٹا جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ کرنل رام سنگھ آ پہنچے ۔ انھوں نے باپو سے رات کا پورا واقعہ سنا ۔ پوری بات سن کر وہ بولے "تمھیں معلوم

ہے وہ اونٹ سوار کون تھا؟ ... نہیں ۔ وہ تھا موزہ سنگھ کا بیٹا لکشمن سنگھ ڈاکو
جو برسوں سے تم سے ملنے کا مشتاق تھا تمہاری نشانے بازی کا قائل ہے وہ،،

باپو اپنے اس قدر دان کو نہیں پہچان پائے تھے ۔ ان دنوں اس اجمیر
میرواڑہ کے مشہور ڈاکو نے ڈکیتی ترک کر دی تھی ۔ آزادی کے بعد اس پر کئی مقدمے
چل رہے تھے اور وہ چھپ چھپا کر رہتا تھا ۔ کرنل کو معلوم تھا کہ اُس شام لکشمن سنگھ
بھی اسی راستے پر روانہ ہوا تھا جس سے کہ باپو آرہے تھے ۔

طلوع آفتاب کے ساتھ ہی باپو اس ڈھلان پر پہنچ چکے تھے جہاں گذشتہ
شب دو چمکتی آنکھوں کے درمیان انھوں نے نشانہ لگایا تھا ۔ وہاں جاکر باپو نے
کیا دیکھا کہ بگھیرا وہیں اس طرح بیٹھا ہوا تھا گویا وہ مردہ نہیں زندہ ہو ۔

راڑاجی

اُودے پور سے تقریباً ۲۲-۲۳ میل کے فاصلے "پر گو گوندا" نام کی سطح سمندر سے ۳۰۰۰ فٹ بلند بستی ہے جو کہ اب اچھا خاصہ قصبہ بن چکی ہے اسی کے قریب 'جوگیوں کا گڑھا' ایک مقام ہے جہاں ہمارے والد تحسین صاحب نے ایسبٹس پتھر (Asbestus) زمین سے برآمد کرنے کا کاروبار کر رکھا تھا۔ وہیں عارضی رہائش کے لئے ایک کٹیا بھی بنا رکھی تھی۔ ہمارا کنبہ اُن دنوں وہیں مقیم تھا جن کے چہرے مندرجہ ذیل واقعہ کا تعلق ہے:

موسم گرما کی رات تھی تاروں بھرا آسمان کسی دلہن کے چہرے کی مانند جگمگا رہا تھا۔ ہوائے خنک اس حسین رات کو خوش گوار بھی بنائے ہوئے تھی۔ اس جنگل میں ہم لوگوں کو یہ مہلت نصیب ہوئی تھی کہ تاریکی کے حسن سے کسی قدر روشناس ہو لیں اور اپنے احساس کو اس کی قدر کرنے کے لائق بھی بنا سکیں۔ مگر حسن قدرت اور اس کے پرت در پرت اسرار کو جاننے کے لئے پوری زندگی بھی ناکافی ہے ۔۔۔۔ خیر ہم کھانے پینے سے فارغ ہو کر اس رات کے حسن سے لطف اٹھا ہی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے کہ قریب سے کسی بچے کے رونے کی آواز ابھری۔ چونک پڑنا فطری بات تھی کہ سنسان جنگل اور ننھے کے رونے کی آواز اور وہ بھی رات کی اس

تاریکی میں۔ سب نے نظر ادھر اُدھر دوڑائی مگر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ سوچا کسی کھیت سے ہی یہ آواز آرہی ہوگی۔

ذرا دیر کے بعد وہی آواز فضا میں بلند ہوئی جو رات کے سناٹے میں زیادہ پُر درد ہوگئی تھی ہم لوگ پھر متوجہ اور متفکر ہو اٹھے کہ یہ آواز متواتر اس طرح کیوں اور کہاں سے آرہی ہے ؟ کسی راہ گیر عورت کے لختِ جگر کی تو یہ آواز ہو نہیں سکتی۔ ہوتی تو لمحہ بہ لمحہ دور جاچکی ہوتی۔ اس کے برعکس یہ آواز متواتر اور مزید تیز ہوتی گئی تھی ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر اس ننھے سے بچے کو جلد نہ تلاش کر لیا گیا تو یہ روتے روتے دم توڑ دے گا۔

آخر باپو نے پاس بیٹھے آدِواسی بھیل مزدور سے اس کی تحقیق کرنے کو کہا مگر وہ نہیں اٹھا بلکہ کہنے لگا۔ "یہ راڑا جی ہے ہجور بالک والک نی ہے۔ ۔ ۔" مجبوراً باپو نے بھائی رضا اور ریاض کو یہ کام سونپا کیوں کہ موہنیا (مزدور) ڈر گیا تھا بچے کا بلبلانا جاری تھا دونوں بھائی ٹارچ لے کر روانہ ہوگئے موہنیا بھی بعد میں ان کے ساتھ ہوگیا۔ کچھ دور آگے بڑھ کر ٹیکری کے ڈھلان پر یہ لوگ رکے اور ٹارچ سے بچہ تلاش کرنے لگے جہاں سے آواز آنے کا اندازہ تھا۔ مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا اس کے برعکس یہ آواز وہاں سے آگے منتقل ہوگئی۔ وہ تینوں بھی آگے بڑھ گئے تھے۔

پورے ماحول میں یہ معصوم گریہ وزاری گھلی جارہی تھی اور یہ تینوں افراد اس

ننھے وجود کو تلاش کر رہے تھے اور اس تلاش میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔
کافی دیر ہو گئی مگر تینوں افراد نہیں لوٹے تھے اب وہ آواز مدھم بھی ہو چکی تھی
آخر ہم لوگ متفکر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی طرف بڑھنے لگے جس طرف یہ
تینوں گئے تھے پھر ہم ٹیکری پر رک کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ یہ سوچ رہے تھے
کہ دونوں بھائی کم عمر ہیں اور ساتھ والا بزدل، اس طرح ان کو نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔
نہ معلوم کیا پیش آئے۔ خدا خیر کرے۔۔۔ باپو بھی فکر مند اور خاموش تھے۔ بولے
"آواز تو آس پاس ہی تھی۔ یہ لڑکے اتنی دور کہاں نکل گئے۔ اور پھر اب تک
واپس بھی نہیں لوٹے جب کہ نصف شب کا وقت ہو گیا ہے"
چمگادڑیں منڈلا رہی تھیں گیدڑوں کے رونے کی آوازیں بھی جنگل میں پھیل
رہی تھی ایک لومڑی بھی ہمارے سامنے سے گذر گئی تھی جس سے ہم سہم گئے تھے۔
اب تک وہ آواز ناپید ہو چکی تھی اور اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا
یکا یک ہمنے دیکھا کہ باپو چونک پڑے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر لڑکوں کو
آواز دینے لگے۔۔۔ یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ اس آواز کی اصلیت باپو پر منکشف
ہو چکی ہے مگر ہماری الجھن اور پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی۔
تبھی دور سے روشنی نظر آئی اس کا مطلب تھا کہ وہ تینوں لوٹ رہے
تھے ٹارچ کی روشنی میں ان کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ جب قریب آ چکے تو وہ بالکل
مطمئن نظر آتے تھے۔ پریشانی کی جگہ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ مگر تینوں

خاموش ہی رہے۔۔۔ آخر باپو ہی گویا ہوئے۔

"آج ہم خوب بے وقوف بن گئے ہیں۔ نہ یہ بچہ تھا نہ یہ اس کے رونے کی آواز تھی بلکہ الو نے ہم سب کو الو بنا دیا۔ کمبخت قسم قسم کی آوازیں نکال لیتا ہے اور جنگل میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔"

ہم سب حیرت وخفت سے ہنس پڑے بوجھل ماحول اب ہلکا ہو گیا تھا۔ پھر باپو سے مزید معلوم ہوا کہ الو کی آوازیں بنا لینے کے علاوہ یہ بھی خاصیت ہے کہ اس کی پرواز کی آواز و آہٹ نہیں ہوتی اس لئے کانوں کو اس کی آمد اور اڑ جانے کی کوئی خبر ہی نہیں ہوتی یہی بات مغالطے اور غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تینوں لڑکے بچہ تلاش کرنے پہنچے تو الو وہاں سے خاموشی کے ساتھ اڑ چکا تھا اور رونے کی آواز آگے بڑھ گئی تھی۔

لڑکوں نے پھر بتایا کہ وہاں انھیں ایک جھونپڑہ ملا جہاں بچے کے ہونے کا احتمال تھا مگر دیکھنے پر مقفل ملا۔ اسی کھپریل پر حضرت الو آنکھیں گھماتے نظر آگئے لہذا سارا ڈرامہ بھی سمجھ میں آگیا۔ یہ سب کچھ دیکھ سن کر مونیا بھی الو جیسی صورت بنائے مسکراتا نظر آرہا تھا شاید اس لئے کہ اس کے راڑا الو کی شکل میں تبدیل ہو چکے تھے۔

بچھو مگری اور اُڑن گلہری

گذشتہ سالوں میں مجھے ہندی ہفتہ وار "دھرم یگ" کے لئے ایک شکاریہ
روداد لکھنی تھی اسی سلسلے میں اپنے والد صاحب کے گرد ہم لوگ کچھ ایسی ہی واردات
سننے کے لئے جمع تھے اور وہ ہمیں اپنی ایک سرگذشت سنانے لگے تھے۔ اسی دوران
انھوں نے بچھوؤں کے متعلق بھی اپنا ایک مشاہدہ بیان کیا: بتلایا کہ ۱۹۲۹ میں وہ شکار
کے دوران پاترواد (ضلع اودے پور) کے جنگلات میں ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے
جہاں بچھوؤں کی اتنی کثرت تھی کہ وہ چیونٹوں کی طرح ہزاروں کی تعداد میں رینگ
رہے تھے یہاں تک کہ وہ پاس کھڑے ہوئے جانور یا آدمی کے جسم پر بھی چڑھ سکتے
تھے... میں نے تو باپو کی کتھنی کے مطابق شکار کا واقعہ قلم بند کر دیا مگر چھوٹے
بھائی رضا کے ذہن میں بچھوؤں کا وہ واقعہ ایسا گھر کر گیا کہ اس نے اس موضوع پر
غور کرنا اور اس سے متعلق مطالعہ شروع کر دیا۔ کئی کتابیں پڑھنے نیز شکوک و شبہات
دور کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہو نہ ہو باپو کی بتلائی ہوئی بچھوؤں والی پہاڑی

کوئی نرالی ہی جگہ ہے جس کا پتہ لگایا ہی جا چاہئے۔

علم حیوانات کی رو سے بچھو قبیلے میں رہنا پسند نہیں کرتا یہاں تک کہ زیادہ کبھی یکجا نہیں رہتے۔ سب سے خوفناک حقیقت اس کیڑے کے منفرد کردار کی یہ ہے کہ فقط جنسی اختلاط کے لئے نر اور مادہ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور اختلاط کے بعد مادہ نر کو مار کر کھا جاتی ہے۔ انڈوں سے نکلے ہوئے بچے سدا ماں کی پیٹھ پر چڑھے رہتے ہیں اور دھیرے دھیرے وہ اپنی ماں کو ہی لقمہ بنانے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ماں بچوں کو اپنی پیٹھ سے گرانے میں کامیاب ہو کر ان کے چنگل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ ایسی عجیب فطرت کی مخلوق اتنی تعداد میں ایک مقام پر کس طرح جمع ہو سکتی ہے یہ سوال رضا کے ذہن میں برابر سر اٹھاتا رہا یہاں تک کہ مدت گذر گئی آخر ۷۱ ۱۹ کے ماہ مارچ میں ایک دن اپنے چھوٹے بھائی رفیق کو ساتھ لے کر بھائی رضا اسی پہاڑی کی تلاش میں نکل پڑے پانی اور کچھ چنے چبینے کے سہارے شام تک تو گذارا ہو گیا مگر گاؤں والوں کے بقول یہ جانور رات کو باہر نکلتا تھا لہٰذا رات کو ہی اسے چوکنے ہو کر تلاش کرنا۔۔۔۔ ابھی باقی تھا۔۔۔۔ دن میں اس کے صرف نشانات تلاش کرتے رہے بھوک پیاس پر قابو رکھنا لازم تھا۔ سائیں سائیں کرتے اس جنگل میں ٹارچ کی روشنی کے سہارے راستے کے باہر گڈھے جھاڑی پیڑ کو ہم ٹٹول رہے تھے نصف شب تک یہ جستجو جاری رہی جس کے بعد ہم پڑاؤ پر لوٹ آئے۔ کئی شب و روز اسی طرح خاک

چھانتے رہے اس دوران کئی نئی باتیں ضرور معلوم ہوئیں ۔ غزال موسٰی کا پتہ اسی دوران لگا جس کے متعلق گاؤں والوں نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا مگر ہم اس کوہ و بیابان میں جس کے متلاشی تھے اس کا کوئی نشان نہیں مل رہا تھا۔

" آخر بادل ناخواستہ آخری کوشش کا دن آیا۔ سارا دن گھوم پھر کر تھک گئے تھے اور ارجُن کے درخت تلے بیٹھے بات چیت کر رہے تھے کہ اس قسم کا جانور پایا جانا محض وہم معلوم ہوتا ہے ورنہ اتنے دن بعد تو وہ کہیں نظر آتی جاتا۔۔ غروب آفتاب ہوچکا تھا لہٰذا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ہم اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک آہٹ ہوئی جیسے کوئی کلی چٹکی ہو۔ دوسرے لمحے ہماری نگاہ درخت کے بالائی حصے پر جا ٹکی ہماری جانب سے پیڑ پر کوئی چیز ہوا میں تیرتی ہوئی مخالف سمت گئی جس پر نظر پڑتے ہی یہ یقین آگیا کہ یہی اُڑن گلہری ہے ۔ اسی وقت بجلی کی سرعت سے ہم ڈھلان سے نالے میں جا پہنچے لیکن وہاں پہنچ کر ٹھٹھک جانا پڑا کیوں کہ نالہ گہرا ہونے سے اسے عبور کرنا مشکل تھا ۔ لہٰذا چکر کھا کر ہم اس کے دوسرے کنارے پہنچے ۔اس وقت تک تاریکی بڑھ چکی تھی ٹارچ کی روشنی سے چھان بین ناکام رہی ۔ جانور دوبارہ نظر نہیں آیا ۔ لوٹتے ہوئے ہم منصوبہ بناتے رہے ۔طے ہوا کہ دو دن اور رکنا ہے خوراک کی راشننگ کی گئی ۔ وہ نشانات ہم نے ذہن نشین کر لئے جو اس دوران ہمیں ملے تھے لہٰذا ہم نے اسی نہج پر اگلے دن اپنی تلاش شروع کی ۔ ایک جگہ جہاں پیڑوں کی چھال اکھڑی

ہوئی دیکھی اسی کے آس پاس ہم نے کھوج بین جاری کر دی ۔ جہاں پیڑ کی جلد تازہ تازہ کتری ہوئی تھی اسی کے مقابل لکڑی کا کوئلہ اور کتھا بنانے کے لئے مشہور گھنے پانروا کے جنگل میں ایک ویران سے ڈاک بنگلے میں دونوں بھائیوں نے پڑاؤ ڈالدیا ۔ متعدد قسم کے درختوں سے بھرا یہ جنگل خاصی کٹائی کے بعد بھی گنجان ہے ۔ ماضی میں ضرور یہ زیادہ ہی پرکشش اور پُراسرار رہا ہوگا جب کہ پرانے لوگ یہاں اکثر شکار کو آیا کرتے تھے ۔ کچھ سستا لینے کے بعد ان دونوں نے اپنی مہم کی ابتدا کر دی ۔ پہلے یہ کوشش کی گئی کہ ساتھ میں کسی مقامی بن باسی کو لے لیا جائے لیکن اس وقت یہ ممکن نہ ہوا ۔

اگلے دن والد کے بتلائے نشانات کے سہارے یہ اس جنگل میں ایک جانب چل پڑے جہاں کہ بچھوؤں کا مسکن ہونے کی توقع تھی ۔ دو دن متواتر گھومنے ... اور چپہ چپہ ٹٹولنے کے بعد تیسرے دن وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ جہاں پہاڑی میں متعدد سوراخ نظر آتے تھے ۔ رضا کے الفاظ میں سوراخ نظر آتے ہی ہم لوگ جوش میں آکر گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گئے اور یہ بھول گئے کہ ہم بچھو بستی کے جویا ہیں ۔ پھر سنبھل کر ہم نے آس پاس کی زمین صاف کی یہ ہی وہ جگہ ہے میں نے رفیق سے کہا، ، سہمتے ہوئے ہم نے چاقو سے کرید کر دیکھا تو ہر چھید میں سے ایک بچھو نکلتا اور رینگ کر پاس ہی کسی پتھر کی اوٹ میں چلا جاتا ۔ آخر ہم نے سوراخوں کو بہ غور دیکھا اور دیکھ کر حیرت میں آگئے ۔ ایسا لگا کہ گویا ٹینس کی

گنبدوں کو اوپر سے کاٹ کاٹ کر زمین میں گاڑ دیا گیا ہے۔ بھیوؤ کے یہ مسکن کافی صاف ستھرے چکنے اور گول تھے اوپر سے دیکھنے میں زمین پہ ایک شگاف سا ہی نظر آتا تھا جیسا کہ سکّے رکھنے کے بکس کا شگاف ہو یہاں ایسے ہی گول گول سکے دان بنے ہوئے تھے۔

ہم بہت خوش تھے دو دن قبل ایسی توقع نہیں تھی کہ ہم اس تلاش میں کامیاب ہو جائیں گے۔ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ اتنے عرصے بعد یہ جگہ اسی پرانی شکل میں کیسے مل سکے گی ــــــ جب ساری پہاڑی پر گھوم کر یہ مشاہدہ ہو چکا اور یہ انکشاف ہوا کہ ایسے ہزار ہا چھید ہیں اور ہر ایک میں بچھو موجود ہے تو کیمرا اٹھایا اور اُن سوراخوں پر سفید جھنڈیاں رکھ رکھ کر چند تصویریں اتاری گئیں۔ غرض کہ شام ہو گئی دونوں بھائی اپنی جائے قیام پر لوٹ آئے۔ جو کچھ کھانے کو تھا کھایا اور سو رہے، رضا نے اپنی بات اس طرح پوری کی۔

بھائی رضا کی ایک دریافت اڑن گلہری بھی ہے۔ یہ دریافت فروری ۱۹۷۹ میں کی گئی ہے۔ اودے پور کے قرب و جوار کے جنگلات سے دریافت اس گلہری کے متعلق دیہات میں کئی قصے مشہور تھے ایک دل چسپ حکایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ ضلع کے دریاو علاقے کے جنگل میں ایک بڑا پرانا کنواں ہے جس کے آس پاس کبھی زرخیز زمین تھی جہاں ابھی آبادی ہوا کرتی تھی یہ آبادی وکرمی ۱۸۵۶ء میں قحط اور اس کے بعد پلیگ کی وبا سے تباہ ہوئی اور یہاں ویرانی

چھا گئی اس کے بعد یہاں جنگل پیدا ہو گیا اور تبھی سے یہ کنواں جنگل کے درمیان ویران پڑا ہے اور اب زہریلا کنواں کہلاتا ہے۔ اسی کنویں سے رات کو ایک منحوس جانور نکلتا ہے جو کہ اڑتا بھی ہے۔ یہ اگر کسی بچے کے سر سے گذر جائے تو وہ لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔ دیہاتی اس عجیب الخلقت جانور کو اڑن بلی اور کہیں روایا کے خیالی نام سے پکارتے ہیں۔

ہر منھ نئی بات سن کر رضا کے ذہن میں اس پر اسرار جانور کا بھید جاننے کا خیال کلبلاتا رہا۔ آخر ان مفروضات کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہو گی۔ جس کو جاننا اہمیت اختیار کر چکا تھا۔

رضا کا بیان ہے کہ ایک افسر جنگلات کی معیت میں وہ اس جانور کی حقیقت جاننے کے لئے نکل پڑے۔ اودے پور سے ۱۶۰ کلو میٹر کے فاصلے پر دریاود کے جنگل میں وہ خیمہ زن ہو گئے جہاں کہ زہریلا کنواں واقع تھا جب جانور کے متعلق گاؤں والوں سے دریافت کیا گیا تو وہ اس کی تفصیل سن کر چونکے اور ہنسے اور پتہ بتلانے کی جگہ ڈراؤنی مبہم باتیں کرنے لگے اس ہدایت کے ساتھ کہ اس جانور کو جاننے کا خیال ترک کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ جو کچھ دیکھنا سمجھنا چاہیں وہ لوگ آپ کے لئے ان کے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔

رضا کہتے ہیں کہ مایوس ہو کر ہم دونوں بھائی ہی اس بیابان میں نکل پڑے چوں کہ پو پھٹنے سے پہلے ہی روانہ ہو گئے تھے لہٰذا اس وقت سیر میں

کافی لطف آیا مگر جیوں دھوپ چڑھنے لگی گرمی تھکان پیاس اور بھوک پریشان کرنے لگی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ میرا اندازہ صحیح نکلا اب ہم منزل تک پہنچ چکے تھے۔ شام ہوتے ہی ہم نے دیکھا پاس کے پیڑ کی اوٹ سے وہ نکلی اور پیڑ کی بالائی شاخ پر پہنچ کر گلائنڈر کی مانند اڑان بھری اور نیچے آکر مقابل کے تنے سے چمٹ کر اس کا چھلکا کھانے لگی۔ بڑے اطمینان سے ہم نے اسے دیکھا۔ اس وقت یہ خلش ہونے لگی تھی کہ اگر جدید انفراریڈ کیمرا ہمارے پاس ہوتا تو اس کے فوٹو لئے جا سکتے تھے۔

دوسرے روز اسی مقام پر ہم نے دو اڑن گلہریاں اڑان بھرتی ہوئی دیکھیں جو ایک درخت سے دوسرے درخت پر پہنچ رہی تھیں۔ وہ ہوا میں تیرتی ہوئی ایک اڑان میں کم و بیش ۸۰ میٹر فاصلہ طے کر سکتی تھیں۔ جسم پر ملائم گھنے بال ہوتے ہیں۔ اس کی پچھلی اور اگلی ٹانگوں کے درمیان ایک جھلی ہوتی ہے جو کہ عام حالت میں سمٹی ہوئی رہتی ہے اور پرواز لینے پر پھیل جاتی ہے جس کے سہارے وہ پتنگ کی مانند تیر سکتی ہے اڑان بھرنے کے لئے وہ ایک چھلانگ لگاتی ہے اس کی زندگی کا مدار پیڑوں کا چھلکا اور سخت قسم کے پھل پر ہے۔ یہ زمین پر شاذ و نادر ہی آتی ہے۔ دن کی روشنی میں یہ درختوں کی کھوہوں میں دم سے اپنا سر چھپائے پڑی رہتی ہے اس کا تعلق (Rodent Family) سے ہے۔

اس کے بعد رضا نے اود ے پور کے سب قریبی جنگلوں میں مستعدی سے تلاش وجستجو کی اور یہ پایا کہ ان کئی مقامات پر یہ نادر جانور موجود ہے. یہ اود ے پور سے ۲۵ کلو میٹر کے فاصلے تک دیکھا گیا۔ لیکن حیرت اس امر پر بھی تو ہے کہ اس سے قبل کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ یہ اڑن گلہری اس علاقے میں موجود ہے ۔

ناقابلِ فراموش

خلاف توقع آج باپو امرکھ جی جانے کو آمادہ ہیں جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے باپو کو کبھی ادھر جاتے نہیں دیکھا ہمارے تقاضے کو بھی وہ ٹالتے رہتے تھے کبھی کسی کا اصرار مان بھی لیا تو امرکھ جی کے موڑ پر پہنچتے ہی گاڑی کا اسٹیرنگ دوسرے کے سپرد کر دیتے۔ مگر ہم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اس کے پیچھے کوئی خاص بات ہے۔

پچھلے دو دن سے رجنی کانت جی جو کہ ایک سوشلسٹ فلم کار ہیں لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں وہ متواتر باپو سے ان کے شکار کے قصے بڑے انہماک سے سنتے جا رہے ہیں۔ ہم بھی اس میں شرکت کر لیتے ہیں مگر جی یہ چاہتا ہے کہ یا تو یہ قصے ہو بہو باپو کے الفاظ میں قلم بند کر لئے جائیں یا ٹیپ کر لئے جائیں۔

اودے پور سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر دور امرکھ جی کے نام سے موسوم ایک خوبصورت سیر گاہ ہے جس کے ایک سرے پر ایک بلند تناور گولر کا درخت

ہے جس کے نیچے ایک شوالہ ہے جس کے قریب ایک جھرنا ہے اور کچھ بلندی پر ایک قدیم مندر بنا ہوا ہے ۔

آج باپو نے سچ مچ اسی طرف اپنی گاڑی کا رخ کر دیا ہے ۔ موڑ پر پہنچ کر فور سلینڈر فورڈ گویا مودبانہ انداز سے رکی ۔ باپو نے دور تک نظر دوڑائی پھر جیب سے پان کی ڈبیا نکال کر پان کھایا اور شاید اسی بہانے خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے ۔ ہم سب لوگ یہ جاننے کو بے تاب تھے کہ آخر یہ کونسی ان کہی کہانی ہے ۔

باپو نے زبان کھولی " یہاں سے جو راستہ مڑ رہا ہے اس پر کوئی آدھ فرلانگ کے بعد جنگل کا یہ عالم تھا کہ پیدل بھی اس میں گذر مشکل تھا ۔ پگڈنڈیاں جانوروں کے نقوشِ پا سے پٹی ہوتی تھیں تیتر بٹیر جنگلی مرغ سو پچاس سے کم تعداد میں کبھی نہ ہوتے تھے ۔ مقابل کی پہاڑی کے نیچے جہاں پانی نظر آتا ہے وہاں بھری دوپہر میں ہم نے بگھیرے آتے جاتے دیکھے ہیں ۔ آج یہ باتیں افسانہ سی لگتی ہیں "

یہ کہتے ہوئے باپو آگے بڑھنے لگے ۔ مندر تک پہنچے بھی نہ تھے کہ پرانا شناسا مقامی کسان راما دوڑتا ہوا باپو کے استقبال کے لئے آپہنچا ۔

ہوا کے جھونکوں نے کیریوں کی خوشبو نتھنوں میں داخل کر دی تھی بھائیوں کے چھوٹے بچے جو ہمرکاب تھے دیکھ کر مچل اٹھے راما نے بہ اصرار گاڑی کا سامان اتروا دیا ۔ ہم سب اتر پڑے ۔ گھاٹی کے ہر دو جانب پہاڑی ہے بائیں پہاڑی ذرا بلند ہے جس کے دامن میں جنگل سے گھرا قدیم مندر

نظر آتا تھا ۔ مندر کے نیچے سڑک بنی ہے ۔ تلہٹی میں ایک گولر کے درخت کے
ساتھ ایک شوالہ اور آبی چشمہ ہے جس کا پانی کنڈ میں جمع ہوتا ہے اور جس سے ایک کچی
نہر نکل کر آب پاشی کرتی ہے ۔

باپو کے ساتھ ہم چل کر اسی پرانے مندر پہ جا بیٹھے اس پر کیف فضا میں
کچھ دیر سانس لینے کے بعد رجنی کانت جی نے سوال کیا ۔" باپو اس اوبر کھابڑ
گھاٹی میں یہ سپاٹ اور ہموار زمین کیسے نکل آئی ہے ؟

باپو نے ایک آہ بھری ۔ میں یہاں آم ، جامن کی جگہ تصور میں ایک
ٹینس کورٹ دیکھ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں سامنے پہاڑں پر ایک کٹیا میں
میں بیٹھا ہوا ایک شخص مجھے کہہ رہا ہے " تحسین یہ جنگل اجڑنے نہ پائے میرا
ٹینس کورٹ یہاں ایسا پوشیدہ رہے کہ قریب کھڑے ہوئے انسان
کی نظر میں بھی نہ آسکے "

سر سکھ دیو کی بات کر رہے ہیں باپو غالباً آپ " بھائی ریاض نے
بات کا سرا پکڑا ۔ ۔ ۔ " نہیں کیسے معلوم ؟ باپو بولے ایک مرتبہ آپ کے
کاغذات میں انکا بنایا ہوا اسی مقام کا نقشہ نظر سے گذرا تھا اتنا یاد ہے "
ٹھیک کہتے ہو تم ۔

" کون تھے یہ سر سکھ دیو " ؟ اب رجنی کانت جی نے سوال کیا ریاست
میواڑ کے مصاحب اعلیٰ یا وزیر اعظم تھے " باپو یہ بتا کر پان کھانے لگے ۔

تقریباً ۴۰ - ۴۵ برس قبل کا یہ ذکر ہے ایک بار سر سکھ دیو کو ہیں ادھر لے آیا تھا غضب کا شوق تھا انھیں جنگل اور پرندوں کے شکار سے ۔اس سلسلے سے مجھ سے انکا تعلق دوستانہ حد تک جا پہنچا ۔ گھنٹوں ہماری ان کی شکار اور جنگل کے موضوع پر گفتگو ہوتی تھی ۔ اس دوران وہ اتنے منہمک ہوتے تھے کہ مصاحبوں کے سلام پر بھی توجہ نہیں کر پاتے تھے ؟ رضا نے پوچھا ۔

" باپو سر سکھ دیو تو ٹانگوں سے معذور بتائے جاتے تھے ، وہ سیر و شکار کیوں کر کرتے تھے ؟ رضا نے پوچھا "

" نہیں کیسے معلوم" ؟

" امی ہی بتایا کرتی تھیں ۔ ریزیڈینسی کلب میں انکا بہت ذکر رہتا تھا" رضا نے جواب دیا ۔

باپو ہنس کر رجنی جی سے مخاطب ہوئے ۔ بھئی ایسی شخصیت اور نہیں دیکھی ہم نے زندگی میں کشمیری برہمن تھے بھیم شہیم جسم اور دمکتا ہوا سرخ و سفید چہرا مزاج سے بڑا ایرسٹوکریٹ مگر نرم دل راجپوتانے کا مسلمہ سیاست داں ۔ مگر جب ہمارے ہمراہ ہوتا تھا تو سب کچھ بھول کر فطرت میں کھو جاتا تھا ۔" پھر رضا کو چٹکی لیتے ہوئے بولے " یہ جو تمھارے وائلڈ لائف تحفظ میں جو نیا لفظ" ون پریمی " (فدائے جنگل) چل پڑا ہے نا ۔ تو ہم نے تو پہلے ہی ایسے ایسے بن پریمی دیکھے ہیں "۔ سن کر ہم

لوگ ہنس دیئے۔

راما اس دوران گنّے کا رس لے آیا۔ شکار کی بھی اس نے تجویز رکھی مگر اس وقت سب کو واقعہ سے ہی دل چسپی تھی۔ خیر ڈبل روٹی قیمہ مٹر اور پکوڑوں کے ساتھ ناشتہ ہونے لگا تھا۔ باپو نے چائے کی چسکی لے کر امی سے کہا "کیوں خورشید سکھ دیو پرساد یاد ہیں نہ کیا آدمی تھا جب سے میں انھیں امر کھ جی لایا تھا اس کے بعد سے وہ اس جنگل کا دیوانہ ہو گیا تھا" مگر کچھ دیر بعد اُداس ہو گئے۔ سوچتا ہوں انھیں میں ادھر نہ لایا ہوتا تو آج یہ مقام اتنا اجاڑ نہ ہوا ہوتا۔

اس دن سکھ دیو پرساد کی ڈیمبلر کار میں ہم دونوں ادھر آ نکلے۔ دور سے ہی وہ اس گھنے جنگل کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی گاڑی رکی کہ وہ مچل اٹھے۔ چکاروں کا جھنڈ قریب سے ہی گذر گیا تھا۔ تیتر کوّے تو سیکڑوں چہل قدمی کر رہے تھے یہیں سے وہ گاڑی سے اتر پڑے۔ دو افراد نے انھیں سہارا دیا جن کے سہارے اندر جنگل میں جا پہنچے وہ جو سڑک کا موڑ ہے وہیں ٹیلے پر بیٹھ گئے اور ہمیں شکار کرنے بھیج دیا۔

سندرولاس کا بھوت

کہانی شکار کی نہیں مگر شکار کے ایک دلچسپ تجربے کی ہے۔
اودے پور سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر دور ناتھ دوار نام کا قصبہ ہے، جو ایک بہت بڑا وشنو تیرتھ ہے۔ یہاں کا شری ناتھ جی کا مندر بھارت کے چند گنے چُنے مندروں میں سے ایک ہے۔ اس مندر کے مہنت شری گوور دھن لال جی مہاراج ہتھیاروں کی پرکھ رکھنے والے اور شوقین تھے۔

ایک دن باپو کے ایک دوست سنگرام سنگھ جی مہتا نے بتایا کہ مہاراج آپ سے ہتھیاروں کے بارے میں رائے لینا چاہتے ہیں، اس کے لیے دیوان صاحب (سنگرام جی سے جن کے اچھے تعلقات تھے) کا پیغام آیا۔

ان دنوں ناتھ دوار کی روایت کے مطابق مہنت شری کسی بھی آدمی سے کسی بھی سلسلے میں رو برو بات نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ

اپنے چیلوں کے ذریعہ کرتے تھے۔ مگر باپو اس معاملے میں بڑے اصول پرست تھے۔ وہ بالواسطہ بات کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے اس لیے باپو نے ناتھ دوار کے دیوان کے بلاوے کو دو شرائط کے ساتھ منظور کیا۔ شرائط یہ تھیں کہ مہنت شری ان سے براہِ راست بات کریں گے اور دوسری کہ بطور سرکاری مہمان ان کے ٹھہرنے کا بند و بست ناتھ دوار میں ہوگا، تبھی وہ وہاں جائیں گے۔ ناتھ دوار کے مہنت شری گووردھن لال جی نے ان کی دونوں شرائط منظور کر لیں۔

جیسے ہی باپو ناتھ دوار پہنچے، وہاں سرکاری گاڑی کے ساتھ شوپال سنگھ نامی ایک ریٹائرڈ فوجی افسر اُن کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ شوپال سنگھ باپو کو ناتھ دوار بازار میں واقع ایک بڑے سے دو منزلہ سرکاری بنگلہ پر لے گئے۔ جہاں باپو کے رہنے کا انتظام تھا۔ دن ڈوبتا جا رہا تھا، گرمی کے موسم کی شام اپنے جوبن پر تھی۔ مہنت شری سے ملاقات بھی اگلے دن ہونی تھی۔ اس لیے آج کی شام باپو کا ارادہ آرام کرنے کا تھا۔ لیکن وہ پورا نہ ہو سکا، کوئی دو گھنٹے چین سے گزرے ہوں گے کہ اچانک ساز کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ بغل کے ہی ایک کمرے میں مشہور مغنّیہ / مطربہ ہنسا بائی ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ بھی سرکاری مہمان تھی۔

فوراً باپو نے شوپال سنگھ کو بلوایا اور کہا "میرے رہنے کا کوئی انتظام کیا جائے، میں یہاں نہیں رہ سکتا۔" اس پر باپو کو لال باغ محل میں ٹھہرانے کی تجویز پیش کی گئی۔ مگر لال باغ محل شہر سے کافی فاصلے پر تھا، اس لیے وہاں جانا بھی باپو نے پسند نہیں کیا۔ تب انھیں سندرولاس باغ دکھایا گیا۔ حالانکہ یہ جگہ شہر میں تھی پھر بھی اس کا باغیچہ جنگل کی مانند تھا۔ وہاں دور تک پھیلے املی اور آموں کے پُرانے درختوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا، پھر بھی وہی جگہ باپو نے اپنے رہنے کے لیے چُنی تھی۔ اس باغیچہ میں اندر داخل ہونے کے لیے ایک گیلری تھی اور اس گیلری کے اوپر ہی رہائش گاہ تھی۔ اوپر چڑھنے کے بعد تقریباً ۳۰-۴۰ فٹ لمبا صحن، اس کے بعد ایک دالان تھا، جس کے باہر ۱۰-۱۲ فٹ کا سائبان تھا۔ کمرے والی چھت پر آم کی ایک بڑی سی شاخ نیچے تک آئی ہوئی تھی۔

شہر کے درمیان ہوتے ہوئے بھی یہ جگہ ایسی ویران کیوں؟ باپو شاید یہی سوچ رہے تھے کہ تبھی ان کے خدمت گار شوپال سنگھ نے انھیں بتایا کہ اس جگہ کو لوگ منحوس مانتے ہیں اور یہاں بھوت پریت اور بد روحیں رہتی ہیں۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ آپ یہاں پر نہ رہیں تو اچھا ہے۔ یہ سُن کر باپو نے جواب دیا، بھئی مجھے تو ان چیزوں کا وہم سے ہے نہیں، نہ میں ان چیزوں سے ڈرتا ہوں، تم بے فکر رہو۔ مگر

شو پال سنگھ کو تسلّی نہیں ہوئی۔ اس لیے پھر بولا کہ صاحب بڑے بڑے جاگیردار بھی یہاں نہیں ٹھہرتے ہیں۔ آپ بھی کوئی اور جگہ دیکھ لیں تو اچھا رہے گا۔ اب تو باپو کا ارادہ اور بھی پکّا ہو گیا کہ اگر واقعی کوئی بھوت یہاں رہتا ہے تو اس سے ملاقات کریں گے اور نہیں تو راز معلوم کریں گے۔ بہرحال شو پال سنگھ نے رات کو باپو کے ساتھ نہ سونے کی معافی چاہی اور باپو نے اس کو بخوشی چھٹی بھی دے دی۔ کیونکہ ان کے ساتھ اپنا نوکر فقیر محمد تو تھا ہی۔ شہر کے درمیان ایسی پُرامن اور پُرسکون جگہ اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔

رات کو بہت دیر تک لوگ باگ باپو کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ جب سب لوگ چلے گئے، انھوں نے بتّی گل کی اور سو گئے۔ فقیر محمد تو پہلے ہی سو چکا تھا، جلد ہی انھیں بھی نیند آ گئی۔ خوب گہری، میٹھی نیند سے وہ تب چونکے جب اوپر چھت پر عجیب و غریب آوازیں ہونے لگیں۔ وہ اٹھے اور غور سے سنا ——— ڈھماڈھم ڈھماڈھم، ڈھماڈھم لگاتار کچھ دیر بجنے کے بعد پھر خاموش ہو جاتا اور لمحہ بھر میں پھر ڈھماڈھم، ڈھماڈھم اور پھر خاموشی ہو جاتی۔ اس طرح تقریباً آدھے گھنٹہ تک شور ہوتا رہا اور پھر سنّاٹا چھا گیا۔ یہ شور کس کا ہو سکتا ہے، سمجھ میں نہ آ سکا، بہت غور و فکر کیا مگر کسی بھی چیز سے

اس کا تاں میں نہیں بیٹھ رہا تھا۔ یوں ہی سوچتے سمجھتے باپو کی پھر آنکھ لگ گئی۔
صبح ہوئی، وہ اُٹھے اور کمرے سے باہر آ کر دیکھا کہ کوئی نشان یا سراغ
رات کے دھماکوں سے متعلق پا سکیں، مگر وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں
آم کی وہ شاخ جو چھت پر جھکی ہوئی تھی، وہ بھیانک سی ضرور لگ رہی تھی۔
فقیر محمد کو رات کی کچھ خبر نہ تھی، وہ اتنی گہری نیند میں سوتا رہا کہ اسے کچھ خبر ہی
نہ ہوئی۔ باپو نے بھی اس کو نہیں بتایا اور نہ ہی کسی اور کو بتایا کہ رات میں
انھوں نے کیا محسوس کیا۔ دن میں مہنت سے ملاقات بہت خوشگوار رہی۔
ہتھیاروں اور تجارت سے متعلق دنیا بھر کی باتیں اور بحث و مباحثے
ہوتے رہے۔ دوپہر کا کھانا ادھر ہی تھا اور شام کو ایک دوست کے
یہاں دعوت تھی۔

دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد رات کے دس گیارہ بجے اپنی
رہائش گاہ پر پہنچے، بستر پر دراز ہونے سے پہلے باپو نے اپنی ٹارچ اُٹھائی
چاروں طرف دیکھا بھالا، کچھ نظر نہ آیا تو وہ جا کر سو گئے۔ رات کو ٹھیک
ڈھائی بجے سے پھر وہی شور بلند ہوا۔ وہی آواز ڈھما ڈھم، ڈھما ڈھم،
ڈھما ڈھم ——— اور سناٹا۔ وہی آدھے گھنٹے تک لگاتار شور ہوتے
رہنا اور پھر سناٹا چھا جانا۔ تین دن تک یہ عجیب و غریب راگ سُننے
کے بعد چوتھے دن باپو نے فقیر محمد کو اٹھایا اور ساری بات سمجھائی اور

ہدایت دی کہ آج رات باہر نکل کر دیکھیں گے اور جو کچھ بھی ہوگا اس سے نپٹا جائے گا۔ پروگرام اس طرح بنا کہ "ڈھماڈھم" کی آواز آتے ہی اُٹھ کھڑے ہوں گے، بندوق بھری ہوئی تیار ہوگی، جسے لے کر باپو کمرے کے دروازے پر تیار کھڑے ہوں گے۔ اب پریشانی یہ تھی کہ کمرے سے باہر نکل کر چھت نہیں دیکھی جا سکتی تھی، کیونکہ باہر سائبان تھا، جس کو پار کرنے کے بعد ہی چھت کو دیکھا جا سکتا تھا، ادھر ڈھماڈھم کی آواز شروع اور ختم ہونے میں اتنا کم وقفہ ہوتا کہ صحیح بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پھر بھی آج تو اس چور کو پکڑنا ہی تھا۔ سب کچھ طے کرنے کے بعد دونوں اپنی اپنی جگہ پر جا سوئے۔

ڈھماڈھم کی آواز میں اتنی یکسانیت نہیں جتنی اس کے شروع ہونے کے وقت میں کہ جیسے ہی رات کے ڈھائی بجے اور آواز آنی شروع ہو گئی۔ جیسے کہ آنے والا گھڑی دیکھ کر آتا ہو، اور کیوں آتا ہے، اس جگہ اور اس وقت سے اس کا اور اس کی اس عجیب و غریب حرکت سے کیا سروکار ہے؟

ان سوالات کے جوابات تو وہی دے سکتا ہے، اگر مل جائے تو۔

دھماکے کے بغیر ہی باپو کی آنکھ کھل گئی۔ ٹارچ جلا کر گھڑی دیکھی، ڈھائی بجنے کو ہی تھے۔ ابھی پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوئے تھے کہ چھت پر قلابازا آ پہنچے اور بجانے لگے ڈھماڈھم، ڈھماڈھم، ڈھماڈھم، ڈھماڈھم،

لیکن اس شور سے پہلے کوئی اور آہٹ یا سرسراہٹ نہیں سُنائی دی جس سے
کسی کے آنے کا سراغ ملتا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے الارم بجا ہو۔ باپو اور
فقیر محمد دونوں دروازے پر پہنچے، جیسے ہی فقیر محمد دروازہ کھولنے
کے لیے ہاتھ بڑھاتا کہ شور رُک جاتا اور باپو چاہتے تھے کہ آواز
کے ہوتے ہی وہ باہر نکلیں اور دیکھیں کہ یہ کیسے ہو رہی ہے۔ ایسا
موقع تو نہیں مل سکا مگر کچھ ہی دیر بعد باہر سے "تڑاک" کی آواز ہوئی۔
تبھی باپو دروازہ کھول کر باہر نکل پڑے۔ سائبان کی بائیں طرف چھت
سے ملی ہوئی دیوار پر رکھے پانی کے مٹکے پر نظر پڑی، جس پر مہمان قلا باز
اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بندوق کی نال کا رُخ
اس طرف ہو چکا تھا، وہ لبلبی دبانے ہی والے تھے کہ ان کے
دماغ میں کوندا سا لپکا "غضب ہو جائے گا۔ اگر گولی چل گئی"
اسی لمحے پانی کا مٹکا پھوٹ گیا اور مہمان قلا باز اپنی لمبی بل کھاتی دُم
کو سمیٹ کر چھلانگیں مار کر بھاگ گئے ـــ یہ تھے لنگور مہاشے
سندرو اس باغ کا "شیطان" یہی تھا۔ ہاں عمر رسیدہ ہونے کی وجہ
سے کافی پہلوان نظر آیا۔ اتنا بھاری بھرکم لنگور شاید کبھی باپو کی نظر سے
نہیں گزرا ہو گا۔

"اُف" باپو نے ٹھنڈی سانس بھری اور شکر ادا کیا کہ ان کے

ہاتھ سے گولی نہیں چلی، فقیر محمد ہکّا بکّا کھڑا دیکھتا رہا۔

دوسرے دن باپو اس باغیچے میں ہر طرف گھومے، دیکھا اور غور کیا تو پتہ چلا کہ آم اور املی کے پیڑوں کا وہ باغیچہ بندروں کی اچھی خاصی رہائش گاہ تھی۔ اس حادثہ کے بعد باپو تقریباً ایک ہفتہ اسی جگہ رہے، مگر اتنے دنوں میں اس طرف نہ ہی کبھی دھیان گیا اور نہ ہی پھر کبھی وہ آواز سُننے میں آئی۔ یہی تھا سندروالاس باغ کا بھوت جس کی دہشت سے اس شاندار باغیچے اور محل کی مخالفت ہو رہی تھی۔